قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1976

اس پرچہ میں :

جماعت اسلامی اور صحابہ کبارؓ

اگلے پرچہ میں :

معماران پاکستان کون تھے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون ۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ــــ ۸ روپے غیر ممالک ــــ ۲ پونڈ	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۹	جولائی ۱۹۷۶ء	شمارہ ۷

فہرست

۱۔ لمعات	
۲۔ حقائق و عبر ...... (۱) غیر مسلم اقلیتیں۔ (۲) نظریۂ پاکستان کا ارتقاء۔ (۳) رام داس نہیں عبدالرحمٰن! (۴) دنیا کا نرالا اچھا گھر! (۵) نظریۂ پاکستان کس نے دیا....؟	۱۱
۳۔ صحابہ کبارؓ اور جماعتِ اسلامی	۱
۴۔ قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید .... (مولانا غلام مرشد)	۳۰
۵۔ قصہ نا گفتنی کتب کا	۴۱
۶۔ نقد و نظر .... (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)	۴۳
۷۔ مقامِ حدیث	۴۷
۸۔ بزمِ مذاکرہ ...... (قسط دوم) ...... (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن اکتوبر ۱۹۷۵ء)	۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس۔ ہسپتال روڈ لاہور

[illegible] Phone. [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1976

اس پرچہ میں :

جماعت اسلامی اور صحابہؓ کبارؓ

اگلے پرچہ میں :

معماران پاکستان کون تھے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
۱ ½	۸۰۸۰۰	سالانہ
ڈیڑھ روپیہ	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان —— ۱۸ روپے غیر ممالک —— ۲ پونڈ
شمارہ ۷	جولائی ۱۹۷۶ء	جلد ۲۹

فہرست

۱ - لمعات . . . .

۲ - حقائق و عبر . . . . (۱) غیر مسلم اقلیتیں - (۲) نظریۂ پاکستان کا ارتقاء - (۳) رام داس نہیں عبدالرحمٰن! (۴) دنیا کا نرالا اُجڑا گھر! (۵) نظریۂ پاکستان کس نے دیا...؟ ۱۱

۳ - صحابہ کبارؓ اور جماعتِ اسلامی ۱

۴ - قائداعظمؒ اور قرآنِ مجید . . . . . . (مولانا غلام مرشد) ۳۰

۵ - قصّہ لائتنی کتب کا ۴۱

۶ - نقد و نظر . . . . (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۴۳

۷ - مقامِ حدیث ۴۰

۸ - بزمِ مذاکرہ . . . . (قسط دوم) . . . . (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن اکتوبر ۱۹۷۵ء) ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

ٹپک اے شمع، آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری!

مَیں تقسیم ہند کے بعد کراچی آیا تو ادھر اُدھر سے لُٹے پٹے قافلوں نے بھی وہاں کا رُخ کیا۔ انہی میں حیدر آباد (دکن) کے ہائی کورٹ کے جج ــــ احمد محی الدین انصاری ــــ بھی تھے۔ وہاں کی زندگی خوش حالیوں اور سربلندیوں کے جھولے جھولتی۔ یہاں آئے تو بے سروساماں، لیکن قلب ایسا مطمئن اور طبیعت ایسی مستغنی کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پہ نہ آیا۔ میری فکر و تحریر سے پہلے سے آشنا تھے۔ ملے تو ایسی محبت اور گرم جوشی سے گویا ساری عمر کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد یہ روابط ایسے گہرے ہوئے کہ ــــ من تو شدم، تو من شدی ــــ کا عالم ہو گیا۔ نگاہ میں کشادگی، قلب میں وسعت، مزاج میں انتہائی انکسار، علمی تبحر کے ساتھ فکر کی گہرائی۔ قرآن سے والہانہ شیفتگی، عشقِ حضورِ رسالتمآبؐ سے سینہ گداز۔ پاک بین و پاکباز۔ مومنانہ صفات کے پیکر۔ قلندرانہ جراتوں کے آئینہ دار۔ حوادثِ زمانہ نے آخری عمر میں مختلف عوارض کی آماجگاہ بنا دیا۔ ان تمام مصائب کو نہایت سکون و استقامت سے برداشت کیا۔ لیکن جب بینائی کمزور ہونے لگی تو اس کا بے حد صدمہ ہوا کہ کہیں تدبّرِ قرآن سے محروم نہ ہو جاؤں۔ علاج سے کچھ افاقہ ہوا تو قریب دو سال تک گویا خلوت نشین سے ہو گئے۔ اور اس کے بعد، اچانک اطلاع دی کہ پرویز صاحب! مبارک ہو مَیں نے لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ کہا کہ میں نے جب محسوس کیا کہ بینائی جا رہی ہے تو فیصلہ کیا کہ جتنی مدت تک بھی فطرت مہلت دے، اس بینائی کو کسی بلند مصرف میں لانا چاہیئے۔ عمر بھر کی آرزو تھی کہ لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ ہو جائے تو یہ قرآنی روشنی کے عام کرنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہو گی۔ مَیں نے آپ سے اس کا تذکرہ اس لئے نہ کیا کہ آپ مجھے اس پُرمشقت کوشش سے روک دیں گے۔ الحمد للہ کہ میری یہ عمر بھر کی آرزو پوری ہو گئی ــــ اب اگر مزید مہلت مل گئی تو جی چاہتا ہے مطالب الفرقان کا بھی ترجمہ کر دوں۔ لیکن عمر نے ایفا نہ کیا ــــ اور ۲۹ مئی کو کراچی سے ایک رفیق نے یہ جگر خراش خبر سنائی کہ:۔

دھر میں اک چراغ تھا نہ رہا۔

عمر بھر کے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور مَیں شاخِ خزاں دیدہ کے زرد پتے کی طرح تنہا رہ گیا ہوں۔ اے صبا! محترمہ بیگم انصاری اور ان کی بچیوں تک اس غمزدہ کا پیغامِ تعزیت پہنچا دے اور مرحوم کی روح سے کہہ دے کہ ؎

چاندنی افسردہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اداس
اِک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہو گیا

خدا تیری خاک کو لحد پر اپنے سحابِ کرم کی بارش برسائے۔ طاب ثراہ و حسن مآب

جگر فگار
پرویز

ٹپک اے شمع، آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری!

مَیں تقسیمِ ہند کے بعد، کراچی آیا تو اِدھر اُدھر سے کُٹے پٹے قافلوں نے بھی وہاں کا رُخ کیا۔ انہی میں حیدر آباد (دکن) کے ہائی کورٹ کے جج —— احمد محی الدین انصاری —— بھی تھے۔ وہاں کی زندگی "خوش حالیوں اور سربلندیوں کے جھولے جھولتی۔ یہاں آئے تو بے سرو سامان، لیکن قلب ایسا مطمئن اور طبیعت ایسی مستغنی کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ میری فکر و تحریر سے پہلے سے آشنا تھے۔ ملے تو ایسی محبت اور گرم جوشی سے گویا ساری عمر کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد یہ روابط ایسے گہرے ہوتے گئے کہ —— من تو شدم، تو من شدی" کا عالم ہو گیا —— نگاہ میں کشادہ، قلب میں وسعت، مزاج میں انتہائی انکسار، علمی تبحر کے ساتھ فکر کی گہرائی۔ قرآن سے والہانہ شیفتگی، عشقِ حضورِ رسالتمآبؐ سے سینہ گداز۔ پاک بین و پاکباز۔ مومنانہ صفات کے پیکر۔ قلندرانہ جرأتوں کے آئینہ دار۔ حوادثِ زمانہ نے آخری عمر میں مختلف عوارض کی آماجگاہ بنا دیا۔ ان تمام مصائب کو نہایت سکون و استقامت سے برداشت کیا۔ لیکن جب بینائی کمزور ہونے لگی تو اس کا بے حد صدمہ ہوا کہ کہیں تدبرِ قرآن سے محروم نہ ہو جاؤں۔ علاج سے کچھ افاقہ ہوا تو قریب دو سال تک گویا خلوت نشین سے ہو گئے۔ اور اس کے بعد، اچانک اطلاع دی کہ پرویز صاحب! مبارک ہو۔ مَیں نے لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ کہا کہ میں نے جب محسوس کیا کہ بینائی جا رہی ہے تو فیصلہ کیا کہ جتنی مدت تک بھی فطرت مہلت دے، اس بینائی کو کسی بلند مصرف میں لانا چاہیئے۔ عمر بھر کی آرزو تھی کہ لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ ہو جائے تو یہ قرآنی روشنی کے عام کرنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہو گی۔ مَیں نے آپ سے اس کا تذکرہ اس لئے نہ کیا کہ آپ مجھے اس پُرمشقت کاوش سے روک دیں گے۔ الحمد للہ کہ میری یہ عمر بھر کی آرزو پوری ہو گئی —— اب اگر مزید مہلت مل گئی تو جی چاہتا ہے مطالب الفرقان کا بھی ترجمہ کر دوں۔ لیکن عمر نے ایفا نہ کیا —— اور ۲۹ مئی کو کراچی سے ایک رفیق نے یہ جگر خراش خبر سنائی کہ:—

دھر میں اک چراغ تھا نہ رہا۔

عمر بھر کے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور مَیں شاخِ خزاں دیدہ کے زرد پتے کی طرح تنہا رہ گیا ہوں۔

اے صبا! محترمہ بیگم انصاری اور ان کی بچیوں تک اس غمزدہ کا پیغامِ تعزیت پہنچا دے اور مرحوم کی روح سے کہہ دے کہ ؎

چاندنی افسردہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اُداس　　　　اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہو گیا

خدا تیری خاک کو لحد پر اپنے سحابِ کرم کی بارش برسائے۔ طاب لہٗ و حسن مآب

جگر فگار

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

لمعات

گذشتہ مئی میں، جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ملک کے (بقول اُن کے پانچ سو) وکلاء کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ اور دیگر ذمہ دار ارکانِ تحریکِ پاکستان کے باب میں جس گستاخی کا مظاہرہ کیا اس کے خلاف کچھ لکھنے کے لئے ہم نے دانستہ تاخیر سے کام لیا۔ کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ اُن کا وہ بیان مستند طور پر ہمارے سامنے آ جائے۔ وہ بیان "طاہر ویکلی" کے حوالے سے ۲۷ مئی ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت (لاہور) میں بھی شائع ہوا ہے اور ۹ مئی ۱۹۷۶ء کے ایشیاء (لاہور) میں بھی (جو ہمیں تاخیر سے ملا) جریدہ ایشیاء کے بیان کے مطابق مودودی صاحب نے یہ کہا تھا کہ:-

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی حکومت نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لا إلٰہ إلا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائدادیں تباہ کروا دیں، یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے، مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

"طاہر ویکلی" میں شائع شدہ الفاظ یہ ہیں:-

> یہاں معاملہ برعکس تھا۔ لڑے اسلام کے نام پر۔ پاکستان کا مطلب کہا! لا إلٰہ إلا اللہ کے نام کے لئے جانیں، عزتیں اور جائیدادیں گنوا دیں، لیکن جب موقع ملا اس کام کو چھوڑ دیا جس کے لئے ملک حاصل کیا تھا۔ اس سے بڑا فراڈ اور دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ مطلوبہ سرزمین قائم ہونے کے فوراً بعد ہی یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام قائم نہیں ہو گا۔

سرزمینِ پاکستان کے حاصل ہونے کے فوراً بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آئی تھی ان میں قائدِ اعظم محمد علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

گذشتہ مئی میں، جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ملک کے (بقول اُن کے پانچ سو) وکلاء کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ اور دیگر ذمہ دار ارکانِ تحریکِ پاکستان کے بارے میں جس گستاخی کا مظاہرہ کیا اس کے خلاف کچھ لکھنے کے لئے ہم نے دانستہ تاخیر سے کام لیا۔ کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ اُن کا وہ بیان مصدقہ طور پر ہمارے سامنے آ جائے۔ وہ بیان "طاہر ویکلی" کے حوالے سے ۲۶ر مئی ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت (لاہور) میں بھی شائع ہوا ہے اور ۹ر مئی ۱۹۷۶ء کے ایشیاء (لاہور) میں بھی (جو ہمیں تاخیر سے ملا) جریدہ ایشیاء کے بیان کے مطابق مودودی صاحب نے یہ کہا تھا کہ:-

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی حکومت نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائدادیں تباہ کروا دیں، یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے، مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

"طاہر ویکلی" میں شائع شدہ الفاظ یہ ہیں:-

> یہاں معاملہ برعکس تھا۔ لڑے اسلام کے نام پر۔ پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الا اللہ کے نام کے لئے جانیں، عزتیں اور جائیدادیں گنوا دیں، لیکن جب موقعہ ملا اس کام کو چھوڑ دیا جس کے لئے ملک حاصل کیا تھا۔ اس سے بڑا فراڈ اور دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ مطلوبہ سرزمین قائم ہونے کے فوراً بعد ہی یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام قائم نہیں ہو گا۔

سرزمینِ پاکستان کے حاصل ہونے کے فوراً بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آئی تھی ان میں قائدِ اعظم محمد علی

جناحؒ سرِفہرست تھے۔ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ لہٰذا مودودی صاحب نے جو کچھ اوپر کہا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے اوّلین ہدف خود قائدِاعظمؒ تھے۔ مودودی صاحب سے متعلق تو ہم ذرا بعد میں کچھ عرض کریں گے، پہلے ہم اُن پانچ سو دکلاء حضرات کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں جو کانفرنس میں شریک تھے۔ قائدِاعظمؒ کو "بابائے قوم" یا "فادر آف دی نیشن" (قوم کا باپ) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم میں یہ پانچ سو وکلاء حضرات بھی شامل ہیں۔ ہم ان پانچ سو حضرات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

۱۔ کیا آپ قائدِاعظمؒ کو "بابائے قوم" (قوم کا باپ) اور اس اعتبار سے خود اپنا باپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ ایسا نہیں سمجھتے تو ذرا جرأت کر کے اس کا اعلان فرما دیجئے تاکہ قوم آپ کے متعلق کسی دھوکے میں نہ رہے۔ اور

۲۔ اگر آپ پوری قوم کی ہمنوائی میں قائدِاعظمؒ کو اپنا باپ سمجھتے ہیں تو یہ فرمایئے کہ آپ کے سامنے ایک شخص آپ کے باپ کو سب سے بڑا فراڈیا اور دھوکہ باز کہتا ہے اور آپ (اگر تالیاں بجا کر نہیں تو کم از کم) نہایت خاموشی سے اسے سُن لیتے ہیں۔ ہم آپ سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں اتنی سی غیرت بھی باقی نہیں رہی کہ ایک شخص آپ کے منہ پر آپ کے باپ کو ایسی گالیاں دے اور آپ "اُس بندۂ گستاخ کا منہ بند نہ کریں"۔ (اقبالؒ) آپ کی غیرت و حمیت کا یہی عالم ہے تو آپ خود سوچ لیجئے کہ دنیائے انسانیت میں آپ کا مقام کیا ہے؟ ——— ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ——— (واضح رہے کہ اِس کانفرنس کی جو روئیداد "ایشیا" میں شائع ہوئی ہے اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ سامعین میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس زبان درازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہو۔)

اِس کے بعد ہم قوم کے صحافیوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ بھی اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ آپ کے سامنے بابائے قوم کو فریبی اور مکّار کہا جائے اور آپ اس کا کوئی نوٹس نہ لیں؟ (جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یادداشت کام کرتی ہے ایک آدھ اخبار کے سوا کسی نے اِس کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اور جنہوں نے کچھ لکھا ہے وہ بھی اِس انداز سے کہ ——— منہ موڑ کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ۔ حالانکہ اِن اخبارات کی کیفیت یہ ہے کہ اِن کے کسی کالم نگار کے خلاف کوئی دوسرا اخبار بے ادبی کے دو لفظ کہہ دیتا ہے تو اس کے خلاف مہینوں چیخ اور پکار ہوتی رہتی ہے۔)

اور اِس کے بعد ہم اپنی قوم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا خدا نخواستہ آپ اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کے شدید احساس سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا ——— حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے ——— اگر کیفیت یہی ہے تو پھر اس قوم کا بھی خدا حافظ اور اس کے ساتھ اِس مملکت کا بھی۔

اب رہے مودودی صاحب، تو اُن کا مسئلہ واضح ہے، علم النّفس (سائیکالوجی) کی تحقیق و تجزیہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے لوگ اگر ہوسِ اقتدار کی تسکین میں ناکام رہیں تو انجامِ کار یا تو وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ مودودی صاحب کے آمرانہ مزاج کے متعلق دو آراء ہو

جناحؒ سرفہرست تھے۔ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ لہٰذا مودودی صاحب نے جو کچھ اوپر کہا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے اوّلین ہدف خود قائدِاعظمؒ تھے۔ مودودی صاحب سے متعلق تو ہم ذرا بعد میں کچھ عرض کریں گے، پہلے ہم اُن پانچ سو دکلاء حضرات کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں جو کانفرنس میں شریک تھے۔ قائدِاعظمؒ کو "بابائے قوم" یا "فادر آف دی نیشن" (قوم کا باپ) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم میں یہ پانچ سو دکلاء حضرات بھی شامل ہیں۔ ہم ان پانچ سو حضرات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ:-

۱- کیا آپ قائدِاعظمؒ کو "بابائے قوم" (قوم کا باپ) اور اس اعتبار سے خود اپنا باپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ ایسا نہیں سمجھتے تو ذرا جرأت کر کے اس کا اعلان فرما دیجئے تاکہ قوم آپ کے متعلق کسی دھوکے میں نہ رہے۔ اور

۲- اگر آپ پوری قوم کی ہمنوائی میں قائدِاعظمؒ کو اپنا باپ سمجھتے ہیں تو یہ فرمایئے کہ آپ کے سامنے ایک شخص آپ کے باپ کو سب سے بڑا فراڈیا اور دھوکہ باز کہتا ہے اور آپ (اگر تالیاں بجا کر نہیں تو کم از کم) نہایت خاموشی سے اسے سُن لیتے ہیں۔ ہم آپ سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں اتنی سی غیرت بھی باقی نہیں رہی کہ ایک شخص آپ کے منہ پر آپ کے باپ کو ایسی گالیاں دے اور آپ "اُس بندۂ گستاخ کا منہ بند نہ کریں"۔ (اقبالؒ) آپ کی غیرت و حمیت کا یہی عالم ہے تو آپ خود سوچ لیجئے کہ دنیائے انسانیت میں آپ کا مقام کیا ہے؟ ——— ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ———

(واضح رہے کہ اس کانفرنس کی جو روئیداد "ایشیا" میں شائع ہوئی ہے اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ سامعین میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس زبان درازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہو۔)

اس کے بعد ہم قوم کے صحافیوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ بھی اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ آپ کے سامنے بابائے قوم کو فریبی اور مکّار کہا جائے اور آپ اس کا کوئی نوٹس نہ لیں؟ (جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے ایک آدھ اخبار کے سوا کسی نے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اور جنہوں نے کچھ لکھا ہے وہ بھی اس انداز سے کہ ——— منہ موڑ کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ۔ حالانکہ اِن اخبارات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے کسی کالم نگار کے خلاف کوئی دوسرا اخبار بے ادبی کے دو لفظ کہہ دیتا ہے تو اس کے خلاف مہینوں چیخ اور پکار ہوتی رہتی ہے۔)

اور اس کے بعد ہم اپنی قوم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا خدا نکردہ آپ اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کے شدید احساس سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا ——— حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے ——— اگر کیفیت یہی ہے تو پھر اس قوم کا بھی خدا حافظ اور اس کے ساتھ اِس مملکت کا بھی۔

اب رہے مودودی صاحب، تو اُن کا مسئلہ واضح ہے۔ علم النّفس (سائیکالوجی) کی تحقیق و تجزیہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے لوگ اگر ہوسِ اقتدار کی تسکین میں ناکام رہیں تو انجامِ کار یا تو وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ مودودی صاحب کے آمرانہ مزاج کے متعلق دو آراء ہو

نہیں سکتیں۔ اِس کی شہادت خود ان کا سارا ماضی ہے۔ جہاں تک اُن کی ہوسِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کی اپنی تحریریں اور جماعتِ اسلامی کی تاریخ اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اور اس باب میں جہاں تک اُن کی مایوسی کا تعلق ہے وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے ایک دن قبل انہوں نے فرمایا تھا کہ کل کے الیکشن کے نتائج خود بتا دیں گے کہ اقتدار کس جماعت کے ہاتھ میں ہوگا اور اس میں انہیں جس قدر ناکامی اور نامرادی ہوئی اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور ملے۔ اِس سے اُن کا دماغی توازن جس حد تک بگڑا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہمیں ایسی شکست ہو گئی ہے تو یہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ ایسے انبیاء گذرے ہیں کہ جو ساری عمر جد و جہد کرتے رہے لیکن انہیں (معاذ اللہ) ایک بھی متبع نہ مل سکا ـــــ علم النفس کے کسی ماہر سے پوچھئے وہ اِسے اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا قرار دے گا؟ جیسے جیسے اِن کی عمر بڑھتی اور مایوسی شدید ہوتی جا رہی ہے اِن کا یہ پاگل پن بھی اِسی شدت سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر آنے والے الیکشن میں بھی نتیجہ وہی ہوا (اور اس میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے) تو اِن کا حشر ایک دنیا دیکھ لے گی۔

جس قائدِاعظمؒ کو یہ مکّار اور فریب کار قرار دے رہے ہیں اُن کے مخالفین تک نے، اُن کے خلاف اور تو بہت کچھ جی چاہے کہا ہو، لیکن انہیں فریب کار کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں تک کہ قائدِاعظمؒ نے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر (جسے وہاں کے عوام اوتار مانتے تھے) کے متعلق کہا کہ یہ شخص (گاندھی) گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس پر اُس ملک میں طوفان برپا ہو گیا لیکن کسی ایک شخص نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ تم بھی تو منافق اور مکّار ہو۔ اس شخص کی وفات پر دنیا کے عظیم ترین اخبار "لنڈن ٹائمز" نے لکھا:۔

> قائدِاعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اُن میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے، ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

اور اُس زمانہ کے مملکتِ ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے ان کی بارگاہ میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا:۔

> ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے اُن ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن اُن کے نور سے ہمیشہ کسبِ فیض حاصل کیا جا سکتا ہے ـــــ قائدِاعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گی۔

نہیں سکتیں۔ اس کی شہادت خود ان کا سارا ماضی ہے۔ جہاں تک اُن کی ہوسِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کی اپنی تحریریں اور جماعتِ اسلامی کی تاریخ اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اور اس باب میں جہاں تک اُن کی مایوسی کا تعلق ہے وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے ایک دن قبل انہوں نے فرمایا تھا کہ کل کے الیکشن کے نتائج خود بتا دیں گے کہ اقتدار کس جماعت کے ہاتھ میں ہوگا اور اس میں انہیں جس قدر ناکامی اور نامرادی ہوئی اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور ملے۔ اس سے اُن کا دماغی توازن جس حد تک بگڑا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہمیں ایسی شکست ہو گئی ہے تو یہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ ایسے انبیاء گذرے ہیں کہ جو ساری عمر جد و جہد کرتے رہے لیکن انہیں (معاذ اللہ) ایک بھی متبع نہ مل سکا ـــــ علم النفس کے کسی ماہر سے پوچھئے وہ اسے اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا قرار دے گا؟ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی اور مایوسی شدید ہوتی جا رہی ہے ان کا یہ پاگل پن بھی اسی شدت سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر آنے والے الیکشن میں بھی نتیجہ وہی ہوا (اور اس میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے) تو ان کا حشر ایک دنیا دیکھ لے گی۔

جس قائدِ اعظمؒ کو یہ مکار اور فریب کار قرار دے رہے ہیں اُن کے مخالفین تک نے، اُن کے خلاف اور تو بہ کچھ جی چاہے کہا ہو، لیکن انہیں فریب کار کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں تک کہ قائدِ اعظمؒ نے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر (جسے وہاں کے عوام اوتار مانتے تھے) کے متعلق کہا کہ یہ شخص (گاندھی) گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس پر اُس ملک میں طوفان برپا ہو گیا لیکن کسی ایک شخص نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ تم بھی تو منافق اور مکار ہو۔ اس شخص کی وفات پر دنیا کے عظیم ترین اخبار "لندن ٹائمز" نے لکھا:۔

> قائدِ اعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اُن میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے، ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

اور اُس زمانہ کے مملکتِ ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے ان کی بارگاہ میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

> ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے اُن ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن اُن کے نور سے ہمیشہ کسبِ فیض حاصل کیا جا سکتا ہے ـــــ قائدِ اعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گی۔

ایسے بلند کردار کے حامل انسان کے متعلق یہ شخص یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ مکار اور فریب کار تھا۔ یہ شخص انہیں یہ کہہ کر مطعون کر رہا ہے کہ حصولِ مملکت سے ایک دن پہلے تک وہ اسلام اسلام پکارتے رہے لیکن اس مملکت کے مل جانے کے بعد انہوں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

چونکہ مودودی صاحب کے عقیدہ کی رُو سے زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا از روئے شریعت واجب ہو جاتا ہے اس لئے ہم انہیں دین اور شریعت کے نام پر تو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ تاریخ کی صداقتوں کو کس طرح جھٹلا سکیں گے؟ آپ کا الزام یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ مملکت کے بعد، اسلام کے متعلق اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ آپ دیکھئے کہ تاریخ کیا کہتی ہے۔ قائداعظمؒ نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے خالق دینا ہال کراچی میں پاکستان کے افسروں سے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا تھا:۔

> پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت چاہئے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر بروئے عمل لائے جا سکیں۔

اس کے بعد انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا۔

> پاکستان کا نسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔

یہ تھے وہ قائداعظمؒ، جن کے متعلق یہ شخص کہہ رہا ہے کہ حصولِ مملکت کے فوراً بعد انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جائیں گے۔ (ضمناً) مودودی صاحب کی طرف سے قائداعظمؒ کو جو گالیاں سنائی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ وہ نہیں جو بیان کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اسی براڈ کاسٹ میں ان کا وہ اگلا فقرہ ہے جو نشتر کی طرح مودودی صاحب کے کلیجے سے پار اتر گیا اور جس زخم کو وہ آج تک سہلا رہے ہیں لیکن وہ مندمل ہونے کے بجائے سرطان بنتا جا رہا ہے ——— انہوں نے فرمایا تھا:۔

> آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد

ایسے بلند کردار کے حامل انسان کے متعلق یہ شخص یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ مکار اور فریب کار تھا۔ یہ شخص انہیں یہ کہہ کر مطعون کر رہا ہے کہ حصولِ مملکت سے ایک دن پہلے تک وہ اسلام اسلام پکارتے رہے لیکن اس مملکت کے مل جانے کے بعد انہوں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

چونکہ مودودی صاحب کے عقیدہ کی رُو سے زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ، بولنا از روئے شریعت واجب ہو جاتا ہے اس لئے ہم انہیں دین اور شریعت کے نام پر تو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ تاریخ کی صداقتوں کو کس طرح جھٹلا سکیں گے؟ آپ کا الزام یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ مملکت کے بعد، اسلام کے متعلق اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ آپ دیکھئے کہ تاریخ کیا کہتی ہے۔ قائداعظمؒ نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے خالق دینا ہال کراچی میں پاکستان کے افسروں سے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا تھا:۔

> پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذّات نہیں تھا۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر بروئے عمل لائے جا سکیں۔

اس کے بعد انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا۔

> پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔

یہ تھے وہ قائداعظمؒ، جن کے متعلق یہ شخص کہہ رہا ہے کہ حصولِ مملکت کے فوراً بعد انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جائیں گے۔ (ضمناً) مودودی صاحب کی طرف سے قائداعظمؒ کو جو گالیاں سنائی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ وہ نہیں جو بیان کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اسی براڈکاسٹ میں ان کا وہ اگلا فقرہ ہے جو نشتر کی طرح مودودی صاحب کے کلیجے سے پار اُتر گیا اور جس زخم کو وہ آج تک سہلا رہے ہیں لیکن وہ مندمل ہونے کے بجائے سرطان بنتا جا رہا ہے —— اُنہوں نے فرمایا تھا:۔

> آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد

ہوتے ہیں اُن کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

یہ تھا قائدِ اعظمؒ کا وہ اعلان، جس نے مودودی صاحب کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ آج تک تڑپتے، تلملاتے، مصروفِ فساد انگیزی رہتے ہیں۔

مودودی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی یہ شور شروع کر دیا تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں۔ بظاہر یہ نعرہ بڑا معصوم بلکہ مقدس نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے عوام اُن کے دامِ فریب کا شکار ہو گئے ـــــ ہم نے اسے "فریب" سے "جوابِ آں غزل" کے طور پر تعبیر نہیں کیا۔ ہم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مودودی صاحب، پاکستان کے خلاف، بہت بڑی سازش لئے ہوئے یہاں آئے تھے یا بھیجے گئے تھے۔ اِس سازش کی تفصیلات تو اپنے وقت پر پیش کی جائیں گی۔ سرِدست آپ مودودی صاحب کی سابقہ زندگی کے صرف سیاسی پہلو کے متعلق دو ایک نکات ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ صحافتی زندگی میں اُن کا سب سے پہلا تعارف جبل پور کے اخبار "تاج" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوا۔ یہ اخبار کٹر کانگرسی تھا۔ اُس کے ایک مقالہ پر اُس کے پرنٹر اور پبلشر گرفتار ہوئے تو مودودی صاحب گرفتاری سے بچنے کے لئے دہلی پہنچ گئے۔

۲۔ دہلی میں وہ، جمعیت العلمائے ہند کے ترجمان "الجمعیت" سے وابستہ ہو گئے۔ یہ نیشنلسٹ علماء کی جماعت کا ترجمان تھا اور کانگریس کا سب سے بڑا موئید اور حامی۔ اس میں وہ پانچ چھ سال تک کام کرتے رہے۔

۳۔ اِس دوران میں انہوں نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری بھی مرتب کی۔

۴۔ تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ساتھ اُن کے روابط کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ جب ۲۵-۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کو (یعنی تقسیمِ ہند کے اعلان کے قریب ایک ماہ پہلے) اسلامی جماعت کا پٹنہ میں ایک اجلاس ہوا تو اس میں مہاتما گاندھی کو بھی مدعو کیا گیا اور وہ، اپنی برارتھنا کی تقریب کو ملتوی کر کے اس میں شریک ہوئے تھے۔

۵۔ مودودی صاحب نے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے خلاف اسکیم یہ پیش کی تھی کہ مسلم اکثریت آبادی کے صوبوں کی حکومت قائم کر کے انڈیا کے ساتھ اس کی فیڈریشن قائم کر دی جائے اور یوں مسلمانوں کو دینی اور ملّی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔

کہہ دیا جائے گا کہ پاکستان میں ہزارہا ایسے افراد موجود ہیں جو کھلے کانگریسی تھے۔ لہٰذا اگر مودودی صاحب بھی کبھی کانگریسی تھے تو یہ کونسی قابلِ اعتراض بات ہے۔ یہ بات قابلِ اعتراض اس لئے ہے کہ اُن لوگوں نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن انہوں نے پاکستان میں آکر کوئی

ہوتے ہیں اُن کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

یہ تھا قائدِاعظمؒ کا وہ اعلان، جس نے مودودی صاحب کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ آج تک تڑپتے، تلملاتے، مصروفِ فساد انگیزی رہتے ہیں۔

مودودی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی یہ شور شروع کر دیا تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں۔ بظاہر یہ نعرہ بڑا معصوم بلکہ مقدّس نظر آتا ہے اور اِسی وجہ سے عوام اُن کے دامِ فریب کا شکار ہو گئے ـــــ ہم نے اِسے "فریب" سے "جوابِ آں غزل" کے طور پر تعبیر نہیں کیا۔ ہم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مودودی صاحب، پاکستان کے خلاف، بہت بڑی سازش لئے ہوئے یہاں آئے تھے یا بھیجے گئے تھے۔ اِس سازش کی تفصیلات تو اپنے وقت پر پیش کی جائیں گی۔ سرِدست آپ مودودی صاحب کی سابقہ زندگی کے صرف سیاسی پہلو کے متعلق دو ایک نکات ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ صحافتی زندگی میں اُن کا سب سے پہلا تعارف جبل پور کے اخبار "تاج" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوا۔ یہ اخبار کٹر کانگرسی تھا۔ اُس کے ایک مقالہ پر اُس کے پرنٹر اور پبلشر گرفتار ہوئے تو مودودی صاحب گرفتاری سے بچنے کے لئے دہلی پہنچ گئے۔

۲۔ دہلی میں وہ، جمعیت العلمائے ہند کے ترجمان "الجمعیت" سے وابستہ ہو گئے۔ یہ نیشنلسٹ علماء کی جماعت کا ترجمان تھا اور کانگریس کا سب سے بڑا موئید اور حامی۔ اس میں وہ پانچ چھ سال تک کام کرتے رہے۔

۳۔ اِس دوران میں انہوں نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری بھی مرتب کی۔

۴۔ تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ساتھ اُن کے روابط کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ جب ۲۵-۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کو (یعنی تقسیمِ ہند کے اعلان کے قریب ایک ماہ پہلے) اسلامی جماعت کا پٹنہ میں ایک اجلاس ہوا تو اس میں مہاتما گاندھی کو بھی مدعو کیا گیا اور وہ، اپنی پرارتھنا کی تقریب کو ملتوی کر کے اس میں شریک ہوئے تھے۔

۵۔ مودودی صاحب نے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے خلاف اسکیم یہ پیش کی تھی کہ مسلم اکثریت آبادی کے صوبوں کی حکومت قائم کر کے انڈیا کے ساتھ اس کی فیڈریشن قائم کر دی جائے اور یوں مسلمانوں کو دینی اور ملّی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔

کہہ دیا جائے گا کہ پاکستان میں ہزارہا ایسے افراد موجود ہیں جو کھلے کانگریسی تھے۔ لہٰذا اگر مودودی صاحب بھی کبھی کانگریسی تھے تو یہ کونسی قابلِ اعتراض بات ہے۔ یہ بات قابلِ اعتراض اس لئے ہے کہ اُن لوگوں نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن انہوں نے پاکستان میں آ کر کوئی

فتنہ نہیں کھڑا کیا۔ جنہوں نے ایسا کچھ کیا ان سے مُواخذہ کیا گیا۔ لیکن مودودی صاحب ہمیشہ یہ پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی کبھی مخالفت نہیں کی تھی (بلکہ اب تو انہیں نظریۂ پاکستان کا خالق بھی بتایا جا رہا ہے) اور پاکستان آکر وہ ایک دن جین سے نہیں بیٹھے۔ کوئی نہ کوئی فتنہ جگاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا نام سازش ہے۔ اسی سلسلہ میں آپ، اُن کے (پاکستان بننے کے فوری بعد) اسلامی قوانین کے نفاذ کے اس مطالبہ کی طرف آیئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اُن کے اِس مطالبہ سے ایسا دکھائی دے گا گویا یہ اسلامی قوانین کسی کتاب میں مرتب شکل میں موجود تھے اور پاکستان کے مختلف فرقے ان کے اسلامی ہونے پر متفق تھے۔ یعنی اُن میں سے کسی کو ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر صورت ایسی ہوتی اور پھر ان قوانین کو ملک میں نافذ نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض قابلِ فہم سمجھا جا سکتا تھا کہ اربابِ اقتدار اسلامی قوانین دانستہ نافذ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِسلامی قانون کی حقیقی صورت کیا ہے، اُس کے متعلق ہم برسوں سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت ہم اُس تفصیل کے صرف نمایاں گوشے سامنے لا رہے ہیں۔

۱۔ مودودی صاحب نے یہ دعویٰ کیا اور اِس پر اکثر علماء حضرات کی ہمنوائی بھی حاصل کر لی کہ اسلامی قوانین اُنہیں کہا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہوں۔ اس بنا پر حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ملک کے قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق وضع کریں۔

۲۔ کامل بیس برس تک مودودی صاحب یہ شور مچاتے رہے کہ اربابِ حکومت بددیانت ہیں، فریب کار ہیں جو کتاب و سنت کے مطابق ضابطۂ قوانین نافذ نہیں کر رہے۔ اِس اعتراض کی بنیاد پر وہ فتنہ پھیلاتے اور فسادات برپا کراتے رہے۔

۳۔ ۱۹۷۰ء میں (طلوعِ اسلام کی مسلسل پکار سے تنگ آ کر) وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:۔

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (اخبار ایشیا مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

یعنی اُنہوں نے یہ اعتراف کر لیا کہ کسی ایسے ضابطۂ قوانین کا موجود ہونا تو درکنار، جو پاکستان میں بسنے والے فرقوں ـــــ حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے نزدیک متفق علیہ ہو، ایسا کوئی مجموعۂ قوانین مرتب بھی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ملک میں حنفی فقہ نافذ کر دی جائے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقوں (اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات) نے شور مچا دیا کہ ہم اسے کسی صورت میں قبول یا برداشت نہیں کریں گے اور اگر ایسا زبردستی کیا گیا تو ملک میں بغاوت پھیل جائے گی۔ (اِن امور کی تفصیل آپ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع شدہ مقالہ میں دیکھئے جس کا عنوان ہے ـــــ "اسلامی مملکت کا خواب، جو کثرتِ تعبیر سے، پریشان ہو گیا" ـــــ)

یہ تھی (اور اب تک ہے) اسلامی ضابطۂ قوانین کی پوزیشن۔ اِس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ پاکستان کی

فتنہ نہیں کھڑا کیا۔ جنہوں نے ایسا کچھ کیا ان سے مؤاخذہ کیا گیا۔ لیکن مودودی صاحب ہمیشہ یہ پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی کبھی مخالفت نہیں کی تھی (بلکہ اب تو انہیں نظریۂ پاکستان کا خالق بھی بتایا جا رہا ہے) اور پاکستان آ کر وہ ایک دن چین سے نہیں بیٹھے۔ کوئی نہ کوئی فتنہ جگاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا نام سازش ہے۔ اسی سلسلہ میں آپ، اُن کے (پاکستان بننے کے فوری بعد) اسلامی قوانین کے نفاذ کے اس مطالبہ کی طرف آیئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اُن کے اِس مطالبہ سے ایسا دکھائی دے گا گویا یہ اسلامی قوانین کسی کتاب میں مرتب شکل میں موجود تھے اور پاکستان کے مختلف فرقے ان کے اسلامی ہونے پر متفق تھے۔ یعنی اُن میں سے کسی کو ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر صورت ایسی ہوتی اور پھر ان قوانین کو ملک میں نافذ نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض قابلِ فہم سمجھا جا سکتا تھا کہ اربابِ اقتدار اسلامی قوانین دانستہ نافذ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِسلامی قانون کی حقیقی صورت کیا ہے، اُس کے متعلق ہم برسوں سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت ہم اُس تفصیل کے صرف نمایاں گوشے سامنے لا رہے ہیں۔

۱۔ مودودی صاحب نے یہ دعویٰ کیا اور اِس پر اکثر علماء حضرات کی ہمنوائی بھی حاصل کر لی کہ اسلامی قوانین اُنہیں کہا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہوں۔ اس بنا پر حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ملک کے قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق وضع کریں۔

۲۔ کامل بیس برس تک مودودی صاحب یہ شور مچاتے رہے کہ اربابِ حکومت بددیانت ہیں، فریب کار ہیں جو کتاب و سنت کے مطابق ضابطۂ قوانین نافذ نہیں کر رہے۔ اِس اعتراض کی بنیاد پر وہ فتنہ پھیلاتے اور فسادات برپا کراتے رہے۔

۳۔ ۱۹۷۰ء میں (طلوعِ اسلام کی مسلسل پکار سے تنگ آ کر) وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:۔

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (اخبار ایشیا مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

یعنی اُنہوں نے یہ اعتراف کر لیا کہ کسی ایسے ضابطۂ قوانین کا موجود ہونا تو درکنار، جو پاکستان میں بسنے والے فرقوں ـــــ حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے نزدیک متفق علیہ ہو، ایسا کوئی مجموعۂ قوانین مرتب بھی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ملک میں حنفی فقہ نافذ کر دی جائے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقوں (اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات) نے شور مچا دیا کہ ہم اسے کسی صورت میں قبول یا برداشت نہیں کریں گے اور اگر ایسا زبردستی کیا گیا تو ملک میں بغاوت پھیل جائے گی۔ (اِن امور کی تفصیل آپ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء) میں شائع شدہ مقالہ میں دیکھئے جس کا عنوان ہے ـــــ "اسلامی مملکت کا خواب، جو کثرتِ تعبیر سے، پریشان ہو گیا" ـــــ)

یہ تھی (اور اب تک ہے) اسلامی ضابطۂ قوانین کی پوزیشن۔ اِس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ پاکستان کی

تشکیل کے فوری بعد مودودی صاحب کا یہ مطالبہ کہ یہاں اسلامی قوانین فوراً نافذ کر دیئے جائیں، کیا معنی رکھتا تھا؟ اس سلسلے میں ذرا اِس حقیقت پر بھی نگاہ رکھئیے کہ اُس زمانے میں پاکستان کی حالت کیا تھی۔ کانگریسی لیڈروں (اور انگریزوں تک) نے بھی تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اب تو جناح کی منشا کو پورا ہو جانے دیجئے لیکن کچھ عرصے کے بعد آپ دیکھئے گا کہ یہ دونوں مملکتیں پھر سے ایک دوسرے میں رل جائیں گی اور مملکت صرف بھارت کی باقی رہ جائے گی۔ پاکستان وجود میں آیا تو ہندوستان سے نکالے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزینوں کے قافلے پاکستان میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ ایک نوزائیدہ مملکت کی کشتی کو ڈبو دینے کے لئے یہی بوجھ کچھ کم نہ تھا کہ اس کے ساتھ ہندو نے دیگر تخریبی حربے بھی استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ تقسیمِ ہند کے معاہدہ کی رو سے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصّے میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے مارچ ۱۹۴۸ء تک صرف چار ہزار سات سو ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔ تقسیم کے وقت چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک طرف پاکستان کی اِس قدر نازک حالت تھی، دوسری طرف بھارت کے عزائم کیا تھے اُس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ وہاں کے ایک سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اِس فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

یہ تھے وہ حالات، جن میں اُس وقت پاکستان گھرا ہوا تھا اور جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اُس نحیف و نزار مریض، محسنِ ملّت (قائدِاعظمؒ) نے اپنی زندگی کے آخری چند سانس بھی بازی پر لگا دیئے تھے۔ مملکت کے تحفّظ کے جذبہ کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ذاتی معالج نے ان سے کہا کہ وہ ایسے مرض کا شکار ہو چکے ہیں جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکتے۔ اُنہوں نے اُس سے کہا کہ اِس بات کو راز میں رکھنا۔ یہ بات کہیں باہر نہ آنے پائے، کیونکہ اِس سے ایک طرف میری قوم پر مایوسی چھا جائے گی اور دوسری طرف پاکستان دشمن قوتیں اِس سے نہ معلوم کس قدر فائدہ اٹھا جائیں۔ چنانچہ حال ہی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ہمیں اُس وقت کہیں اِس کا علم ہو جاتا تو ہم تقسیمِ ہند کے معاملہ میں اتنی جلدی نہ کرتے۔ تھوڑے سے عرصے کی بات تھی۔ قائدِاعظمؒ کی وفات کے بعد نقشہ کچھ اور ہوتا۔

یہ تھے ملک کے وہ حالات، جن میں مودودی صاحب وہ فتنہ لے کر کھڑے ہو گئے جس کے نتیجے میں یہاں مختلف فرقوں میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ اُس وقت سب سے بڑا اہم مسئلہ (اور خود قرآنِ کریم کی رو سے مملکت کا فریضہ) یہ تھا کہ وہ اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھتی۔ قائدِاعظمؒ نے اِس فریضہ کو اِس حُسن و خوبی سے سرانجام دیا جس سے، ہم تو ایک طرف، آنے والی نسلوں تک ان کے زیرِ بارِ احسان رہیں گی۔ ایسے شخص کو مودودی صاحب مکّار اور فریب کار قرار دے رہے ہیں! قائدِاعظمؒ، مکّار اور فریب کار نہیں تھا۔ مودودی صاحب کو صدمہ اِس بات کا ہے کہ وہ اِن کے فریب میں کیوں نہ آ گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اِن کے بجائے کوئی

تشکیل کے فوری بعد مودودی صاحب کا یہ مطالبہ کہ یہاں اسلامی قوانین فوراً نافذ کر دیئے جائیں، کیا معنی رکھتا تھا؟ اس سلسلے میں ذرا اِس حقیقت پر بھی نگاہ رکھئے کہ اُس زمانے میں پاکستان کی حالت کیا تھی۔ کانگریسی لیڈروں (اور انگریزوں تک) نے بھی، تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اب تو جناحؒ کی منہ کہ پورا ہو جانے دیجئے لیکن کچھ عرصے کے بعد آپ دیکھئے گا کہ یہ دونوں مملکتیں پھر سے ایک دوسرے میں مِل جائیں گی اور مملکت صرف بھارت کی باقی رہ جائے گی۔ پاکستان وجود میں آیا تو ہندوستان سے نکالے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزینوں کے قافلے پاکستان میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ ایک نوزائیدہ مملکت کی کشتی کو ڈبو دینے کے لئے یہی بوجھ کچھ کم نہ تھا کہ اِس کے ساتھ ہندو نے دیگر تخریبی حربے بھی استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ تقسیم ہند کے معاہدہ کی رو سے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصّے میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے مارچ ۱۹۴۸ء تک صرف چار ہزار سات سو ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔ تقسیم کے وقت چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اِس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک طرف پاکستان کی اِس قدر نازک حالت تھی، دوسری طرف بھارت کے عزائم کیا تھے اُس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ وہاں کے ایک سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اِس فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

یہ تھے وہ حالات، جن میں اُس وقت پاکستان گھرا ہوا تھا اور جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اُس نحیف و نزار مریض، محسنِ ملّت (قائدِاعظمؒ) نے اپنی زندگی کے آخری چند سانس بھی بازی پر لگا دیئے تھے۔ مملکت کے تحفظ کے جذبہ کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ذاتی معالج نے ان سے کہا کہ وہ ایسے مرض کا شکار ہو چکے ہیں جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکتے۔ اُنہوں نے اُس سے کہا کہ اِس بات کو راز میں رکھنا۔ یہ بات کہیں باہر نہ آنے پائے، کیونکہ اِس سے ایک طرف میری قوم پر مایوسی چھا جائے گی اور دوسری طرف پاکستان دشمن قوتیں اِس سے نہ معلوم کس قدر فائدہ اٹھا جائیں چنانچہ حال ہی میں لارڈ مائونٹ بیٹن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ہمیں اُس وقت کہیں اِس کا علم ہو جاتا تو ہم تقسیم ہند کے معاملہ میں اتنی جلدی نہ کرتے۔ تھوڑے سے عرصے کی بات تھی۔ قائدِاعظمؒ کی وفات کے بعد نقشہ کچھ اور ہوتا۔

یہ تھے ملک کے وہ حالات، جن میں مودودی صاحب وہ فتنہ لے کر کھڑے ہو گئے جس کے نتیجے میں یہاں مختلف فرقوں میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ اُس وقت سب سے بڑا اہم مسئلہ (اور خود قرآن کریم کی رو سے مملکت کا فریضہ) یہ تھا کہ وہ اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھتی۔ قائدِاعظمؒ نے اِس فریضہ کو اِس حُسن و خوبی سے سرانجام دیا جس سے، ہم تو ایک طرف، آنے والی نسلوں تک ان کے زیرِ بارِ احسان رہیں گی۔ ایسے شخص کو مودودی صاحب مکّار اور فریب کار قرار دے رہے ہیں! قائدِاعظمؒ، مکّار اور فریب کار نہیں تھا۔ مودودی صاحب کو صدمہ اِس بات کا ہے کہ وہ اِن کے فریب میں کیوں نہ آ گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اِن کے بجائے کوئی

سطح ہیں جذباتی قسم کا لیڈر ہوتا تو وہ یقیناً مودودی صاحب کے اس دام فریب میں پھنس کر یہاں نفاذ شریعت کا مسئلہ کھڑا کر دیتا۔ اس سے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی اور چند دنوں کے اندر اس مملکت کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ مملکت بھارت کی باقی رہ جاتی اور اس میں مودودی صاحب کو ان کی ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں شیخ الاسلام کی گدی ضرور مل جاتی ——— مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ :۔

> اس مقصد کے لئے سرکاری طور پر ایک کمیٹی بٹھادی جاتی اور چند مہینوں میں اس کو (اسلامی قانون کو) مدون کیا جا سکتا تھا، کوئی دقت نہ تھی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ان کے اندر خواہش اور ارادہ موجود نہیں تھا اور اب بھی موجود نہیں ہے۔

مرحوم صدر مملکت فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے، جس طرح کہ خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں ...... اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے، ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔ (نوائے وقت لاہور - ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اگر مودودی صاحب اپنے مطالبہ میں دیانتدار ہوتے تو صدر کی اس دعوت پر لبیک کہتے۔ لیکن انہیں تو معلوم تھا کہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا، اور اگر اس قسم کی کوئی کمیٹی بنا دی گئی تو ان کی ساری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لئے اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ شخص (صدر ایوب مرحوم) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔ یہ کچھ مودودی صاحب نے جنوری ۱۹۶۹ء میں کہا تھا، اور اس کے قریب ڈیڑھ سال بعد اگست ۱۹۷۰ء میں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ملک میں مختلف فرقوں کے اختلافات ایسے ہیں جن کی موجودگی میں کوئی متفقہ ضابطۂ قوانین، مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ مودودی صاحب کی یہی وہ سازشیں تھیں جن کے پیش نظر صدر ایوب نے اپنی یکم دسمبر ۱۹۶۳ء کی ماہانہ نشری تقریر میں کہا تھا کہ :۔

> اب ایک، اوروں سے زیادہ مکار شخص، مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آ گیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔
>
> (امروز لاہور - ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء)

(ضمناً) اس سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو گئی ہوگی کہ مودودی صاحب نے "بحالیٔ جمہوریت" کے نقاب میں

سطح پر جذباتی قسم کا لیڈر ہوتا تو وہ یقیناً مودودی صاحب کے اس دام فریب میں پھنس کر یہاں نفاذ شریعت کا مسئلہ کھڑا کر دیتا۔ اس سے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی اور چند دنوں کے اندر اس مملکت کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ مملکت بھارت کی باقی رہ جاتی اور اس میں مودودی صاحب کو ان کی ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں شیخ الاسلام کی گدی ضرور مل جاتی ——— مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ:-

> اس مقصد کے لئے سرکاری طور پر ایک کمیٹی بٹھا دی جاتی اور چند مہینوں میں اس کو (اسلامی قانون کو) مدون کیا جا سکتا تھا، کوئی دقت نہ تھی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ان کے اندر خواہش اور ارادہ موجود نہیں تھا اور اب بھی موجود نہیں ہے۔

مرحوم صدر مملکت فیلڈ مارشل ایوب خان نے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے، جس طرح کہ خدا اور رسول کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں ...... اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے، ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔ (نوائے وقت لاہور - ۳۱ دسمبر ۱۹۶۵ء)

اگر مودودی صاحب اپنے مطالبہ میں دیانتدار ہوتے تو صدر کی اس دعوت پر لبیک کہتے۔ لیکن انہیں تو معلوم تھا کہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا، اور اگر اس قسم کی کوئی کمیٹی بنا دی گئی تو ان کی ساری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لئے اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ شخص (صدر ایوب مرحوم) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔ یہ کچھ مودودی صاحب نے جنوری ۱۹۶۹ء میں کہا تھا، اور اس کے قریب ڈیڑھ سال بعد اگست ۱۹۷۰ء میں ان کا اعتراف کرنا پڑا کہ ملک میں مختلف فرقوں کے اختلافات ایسے ہیں جن کی موجودگی میں کوئی متفقہ ضابطۂ قوانین، مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ مودودی صاحب کی یہی وہ سازشیں تھیں جن کے پیش نظر صدر ایوب نے اپنی یکم دسمبر ۱۹۶۳ء کی ماہانہ نشری تقریر میں کہا تھا کہ:-

> اب ایک، اوروں سے زیادہ مکار شخص، مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آ گیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔
> (امروز لاہور - ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء)

(ضمناً) اس سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو گئی ہو گی کہ مودودی صاحب نے "بحالی جمہوریت" کے نقاب میں

صدر ایوب کے خلاف جو مہم شروع کی تھی اُس کا ہدف یہ حرکہ کیا تھا۔

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ :-

> میں واضح طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے، اُن کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو، جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

اِس سے یہ واضح ہے کہ مودودی صاحب کے پاس ایسے احکام مدوّن شدہ موجود ہیں جنہیں ملک میں فوراً نافذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی اس مضحکہ انگیز پوزیشن پر بھی غور کیجئے کہ اُسی کانفرنس میں خود مودودی صاحب کے زیرِ ہدایت اِنہی وکلاء پر مشتمل کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اسلامی قوانین مدوّن کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب اس پوزیشن میں ہیں کہ اُن کے ہاتھ میں آج اقتدار دے دیا جائے تو وہ کل ہی اسلامی قوانین کو نافذ کر دیں، تو پھر یہ کمیٹیاں کاہے کے لئے بٹھائی جا رہی ہیں؟ لیکن ہمیں حیرت مودودی صاحب پر نہیں، وہ تو عمر بھر ایسے ہی کھیل کھیلتے رہے ہیں، ہمیں افسوس ان وکلاء حضرات پر ہے جنہوں نے مودودی صاحب کی زبانِ مبارک سے یہ بھی سنا کہ وہ ایک ہی دن میں ملک میں قوانینِ شریعت نافذ کر سکتے ہیں اور پھر انہیں کے زیرِ ہدایت قانون سازی کے لئے کمیٹیاں بنا کر بھی بیٹھ گئے۔ دوسری بات یہ کہ کیا اِن وکلاء حضرات نے مودودی صاحب سے یہ بھی پوچھا ہے کہ جس قانون کی تدوین کا فریضہ اِن کے سپرد کیا جائے گا اُس کی اساس اور بنیاد کیا ہو گی؟ کتاب و سنت تو اِس کی بنیاد ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین، مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ اساس نہیں ہو گی تو پھر اور کونسی اساس ہو گی۔ نہ مودودی صاحب نے ایسا بتایا، نہ انہوں نے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی — اس لئے کہ دونوں جانتے ہیں کہ یہ صرف الیکشن سٹنٹ ہے۔ لیکن مودودی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں اِس سے بھی حصولِ اقتدار میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ اِس لئے کہ خالص میکیاولی سیاست عارضی ہی سہی، کامیاب ہو جاتی ہے لیکن مذہب کے نقاب میں سیاست کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی خواہ اُس کے لئے کتنا ہی روپیہ سیلاب کی طرح کیوں نہ بہا دیا جائے۔ اور وکلاء کانفرنس کی قسم کے کتنے ہی نمائشی اسٹال کیوں نہ ایستادہ کر دیئے جائیں۔ لوگ اب اُن کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں جیسا کہ ۱۹۷۰ء کے نتیجے میں دیکھا جا چکا ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔

صدر ایوب کے خلاف جو مہم شروع کی تھی اُس کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ:-

> میں واضح طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے، اُن کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو، جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز اِن کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

اِس سے یہ واضح ہے کہ مودودی صاحب کے پاس ایسے احکام مدوّن شدہ موجود ہیں جنہیں ملک میں فوراً نافذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی اس مضحکہ انگیز پوزیشن پر بھی غور کیجئے کہ اسی کانفرنس میں خود مودودی صاحب کے زیرِ ہدایت اِنہی وکلاء پر مشتمل کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اسلامی قوانین مدوّن کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب اس پوزیشن میں ہیں کہ اُن کے ہاتھ میں آج اقتدار دے دیا جائے تو وہ کل ہی اسلامی قوانین کو نافذ کر دیں، تو پھر یہ کمیٹیاں کاہے کے لئے بٹھائی جا رہی ہیں؟ لیکن ہمیں حیرت مودودی صاحب پر نہیں، وہ تو عمر بھر ایسے ہی کھیل کھیلتے رہے ہیں، ہمیں افسوس ان وکلاء حضرات پر ہے جنہوں نے مودودی صاحب کی لسانِ مبارک سے یہ بھی سنا کہ وہ ایک ہی دن میں ملک میں قوانینِ شریعت نافذ کر سکتے ہیں اور پھر اُنہیں کے زیرِ ہدایت قانون سازی کے لئے کمیٹیاں بنا کر بھی بیٹھ گئے۔ دوسری بات یہ کہ کیا اِن وکلاء حضرات نے مودودی صاحب سے یہ بھی پوچھا ہے کہ جس قانون کی تدوین کا فریضہ اِن کے سپرد کیا جائے گا اُس کی اساس اور بنیاد کیا ہو گی؟ کتاب و سنت تو اِس کی بنیاد ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین، مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ اساس نہیں ہو گی تو پھر اور کونسی اساس ہو گی۔ نہ مودودی صاحب نے ایسا بتایا، نہ انہوں نے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی — اس لئے کہ دونوں جانتے ہیں کہ یہ صرف الیکشن سٹنٹ ہے۔ لیکن مودودی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں اِس سے بھی حصولِ اقتدار میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ اِس لئے کہ خالص دنیاوی سیاست عارضی ہی سہی، کامیاب ہو جاتی ہے لیکن مذہب کے نقاب میں سیاست کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی خواہ اُس کے لئے کتنا ہی روپیہ سیلاب کی طرح کیوں نہ بہا دیا جائے۔ اور وکلاء کانفرنس کی قسم کے کتنے ہی نمائشی اسٹال کیوں نہ ایستادہ کر دیئے جائیں۔ لوگ اب اِن کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں جیسا کہ ۱۹۷۰ء کے نتیجے میں دیکھا جا چکا ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔

حقائق و عبر

۱۔ غیر مسلم اقلیتیں

شروع جون میں پاکستان میں اقلیتوں کا ہفتہ منایا گیا۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کی رُو سے، اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کی جان، مال، عزت، آبرو، حتیٰ کہ اُن کی مذہبی پرستش گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ اس بنا پر، پاکستانی غیر مسلموں کو عندالضرورت، ان تحفظات کی یقین دہانی اچھا اقدام ہے۔ لیکن اس یقین دہانی کے ساتھ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس اسلام نے اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کو اس قدر تحفظات کی ضمانت دی ہے، اسی اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ اِس مملکت (بلکہ ساری دنیا میں) بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ یہ دو جُداگانہ قوموں کے افراد ہوتے ہیں۔ اسی کو "دو قومی نظریہ" کہتے ہیں جس پر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی اور جس بنیاد پر مملکتِ پاکستانیہ کی عمارت استوار ہے۔ اس وضاحت کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ تحفظِ حقوق کی ضمانت سے غیر مسلم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

۲۔ نظریۂ پاکستان کا ارتقاء

ہمارے ہاں نظریۂ پاکستان بھی معمّہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے مخالفین اسے جو جو معانی پہناتے ہیں، اسے تو چھوڑیئے۔ اس کے موافقین کا بھی اس کے متعلق ذہن صاف نہیں۔ مثلاً نوائے وقت (لاہور) کی ۳۰ مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے صفحۂ اوّل پر ایک مبسوط مقالہ، نظریۂ پاکستان کے حق میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نظریۂ پاکستان کا ارتقاء"۔ یہ عنوان بتا رہا ہے کہ اس باب میں صاحبِ مضمون کا بھی ذہن صاف نہیں۔ ارتقاء کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کا نامکمل شکل میں آغاز، اور اس کے بعد اس کا رفتہ رفتہ، بتدریج ترقی کر کے تکمیل تک پہنچنا ـــــ نظریۂ پاکستان کی قطعاً یہ کیفیت نہیں۔ وہ خُدا کے ابدی اصولوں کی طرح یومِ اوّل ہی سے مکمل شکل لئے ہوئے تھا، اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ نظریۂ پاکستان ہے ـــــ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ـــ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہ اساسی اصول یا نظریہ، رفتہ رفتہ، ترقی حاصل کر کے، اس مقام تک

حقائق و عبر

۱۔ غیر مسلم اقلیتیں

شروع جون میں پاکستان میں اقلیتوں کا ہفتہ منایا گیا۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کی رُو سے، اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کی جان، مال، عزت، آبرو، حتیٰ کہ اُن کی مذہبی پرستش گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ اس بنا پر، پاکستانی غیر مسلموں کو عند الضرورت، ان تحفظات کی یقین دہانی اچھا اقدام ہے۔ لیکن اس یقین دہانی کے ساتھ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس اسلام نے اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کو اس قدر تحفظات کی ضمانت دی ہے، اسی اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ اِس مملکت (بلکہ ساری دنیا میں) بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ یہ دو جُداگانہ قوموں کے افراد ہوتے ہیں۔ اسی کو "دو قومی نظریہ" کہتے ہیں جس پر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی اور جس بنیاد پر مملکتِ پاکستانیہ کی عمارت استوار ہے۔ اس وضاحت کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ تحفظِ حقوق کی ضمانت سے غیر مسلم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

۲۔ نظریۂ پاکستان کا ارتقاء

ہمارے ہاں نظریۂ پاکستان بھی معمّہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے مخالفین اسے جو جو معانی پہناتے ہیں، اسے تو چھوڑیئے۔ اس کے موافقین کا بھی اس کے متعلق ذہن صاف نہیں۔ مثلاً نوائے وقت (لاہور) کی ۳۰ مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے صفحۂ اوّل پر ایک مبسوط مقالہ، نظریۂ پاکستان کے حق میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نظریۂ پاکستان کا ارتقاء"۔ یہ عنوان بتا رہا ہے کہ اس باب میں صاحبِ مضمون کا بھی ذہن صاف نہیں۔ ارتقاء کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کا نامکمل شکل میں آغاز، اور اس کے بعد اس کا رفتہ رفتہ، بتدریج ترقی کر کے تکمیل تک پہنچنا ـــــ نظریۂ پاکستان کی قطعاً یہ کیفیت نہیں۔ وہ خُدا کے ابدی اصولوں کی طرح یومِ اوّل ہی سے مکمل شکل لئے ہوئے تھا، اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ نظریۂ پاکستان ہے ـــــ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ـــ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہ اساسی اصول یا نظریہ، رفتہ رفتہ، ترقی حاصل کر کے، اس مقام تک

نہیں پہنچا۔ یہ روزِ اوّل سے ایسا ہی تھا۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھئے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضور نبی اکرمؐ تک ہر رسولؑ کی دعوت کا آغاز اس سے ہوتا تھا کہ: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ (۱۱/۶۱) یعنی لا الٰہ الا اللہ۔ یہی وہ دین ہے جس کے متعلق کہا کہ: مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ..... (۴۲/۱۳) "جس کا حکم نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسےٰؑ و عیسےٰؑ کو دیا گیا تھا۔ اور اب (اے رسولؐ!) تیری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔ یہی وہ دین ہے جسے قائم کرنے کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اور یہی نظریۂ پاکستان تھا۔ لہٰذا، اس نظریہ میں ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ رام داس نہیں عبدالرحمٰن

کچھ عرصہ سے، اخبارات میں "اسلامی ترقیاتی بینک" کے قیام کی خبریں شائع ہو رہی ہیں جس کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں سودی کاروبار نہیں ہوگا۔ یہ خصوصیت بڑی روح پرور اور مسرت افزا ہے۔ لیکن اب جو اس کی تفصیلات باہر آ رہی ہیں تو اُن سے معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق، جامعہ محمدی شریف، جھنگ، کے ماہنامہ الجامعہ کی مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں تحریر ہے کہ گذشتہ ماہ (اپریل) میں، اسلامی ترقیاتی بینک کے پریذیڈنٹ، ڈاکٹر احمد محمد علی، نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران فرمایا کہ:-

> بنک اس سال کے اختتام سے پہلے کام شروع کر دے گا۔ اس کا صدر دفتر جدّہ میں ہوگا۔ اور کل سرمایہ ۲ ارب دینار یا ۲۵ ارب روپے ہوگا۔ بنک اپنے ممبر ممالک کو تعلیم، صحتِ عامہ، صنعت، تعمیرات، زراعت اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے بلاسود قرضہ جات دے گا۔ سرمایہ لگانے والے ممالک کو سُود کی بجائے اصل منافع حصہ رسدی تقسیم کیا جائے گا جس کی مقدار یقیناً سُود کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوگی۔ سرمایہ کی فراہمی میں شریک ہونے والے ممالک اسلامی ہوں گے۔ ان کے مالی تعاون کا صدق دل سے خیرمقدم کیا جائے گا۔ بنک کی یہ خصوصیات کہ اس کا کاروبار سود کی نحوست سے پاک ہوگا۔ نہایت مبارک ہے ایسا بنکاری نظام جس میں سُود شامل نہ ہو بظاہر ایک عجوبہ تصوّر کیا جائے گا، کیوں کہ سودی نظام پر یقین رکھنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنکاری نظام سُود کی شمولیت کے بغیر چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر اسلامی اخوّت کا یہ معجزہ زندہ

نہیں پہنچا۔ یہ روزِ اوّل سے ایسا ہی تھا۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضور نبی اکرمؐ تک ہر رسولؑ کی دعوت کا آغاز اس سے ہوتا تھا کہ: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ (۷/۵۹) یعنی لا الٰہ الا اللہ۔ یہی وہ دین ہے جس کے متعلق کہا کہ: مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ..... (۴۲/۱۳) "جس کا حکم نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسےٰؑ و عیسےٰؑ کو دیا گیا تھا۔ اور اب (اے رسولؐ!) تیری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔ یہی وہ دین ہے جسے قائم کرنے کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اور یہی نظریۂ پاکستان تھا۔ لہٰذا، اس نظریہ میں ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ رام داس نہیں عبدالرحمٰن

کچھ عرصہ سے، اخبارات میں "اسلامی ترقیاتی بینک" کے قیام کی خبریں شائع ہو رہی ہیں جس کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں سودی کاروبار نہیں ہوگا۔ یہ خصوصیت بڑی روح پرور اور مسرت افزا ہے۔ لیکن اب جو اس کی تفصیلات باہر آ رہی ہیں تو اُن سے معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق، جامعہ محمدی شریف، جھنگ، کے ماہنامہ الجامعہ کی مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں تحریر ہے کہ گذشتہ ماہ (اپریل) میں، اسلامی ترقیاتی بینک کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر احمد محمد علی نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران فرمایا کہ:۔

> بنک اس سال کے اختتام سے پہلے کام شروع کر دے گا۔ اس کا صدر دفتر جدّہ میں ہوگا۔ اور کل سرمایہ ۲ ارب دینار یا ۲۵ ارب روپے ہوگا۔ بنک اپنے ممبر ممالک کو تعلیم، صحتِ عامہ، صنعت، تعمیرات، زراعت اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے بلاسود قرضہ جات دے گا۔ سرمایہ لگانے والے ممالک کو سُود کی بجائے اصل منافع حصہ رسدی تقسیم کیا جائے گا جس کی مقدار یقیناً سُود کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوگی۔ سرمایہ کی فراہمی میں شریک ہونے والے ممالک اسلامی ہوں گے۔ ان کے مالی تعاون کا صدق دل سے خیرمقدم کیا جائے گا۔ بنک کی یہ خصوصیات کہ اس کا کاروبار سود کی نحوست سے پاک ہوگا۔ نہایت مبارک ہے ایسا بنکاری نظام جس میں سُود شامل نہ ہو بظاہر ایک عجوبہ تصوّر کیا جائے گا، کیوں کہ سودی نظام پر یقین رکھنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنکاری نظام سُود کی شمولیت کے بغیر چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر اسلامی اخوّت کا یہ معجزہ زندہ

حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ اب ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی اقدار پر مشتمل قرآنی ضابطے ہر دور اور ہر ملک کی معاشی، معیشتی اور اقتصادی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ سرمایہ مسلمان ممالک کا ہوگا۔ اس سے استفادہ کرنے والے ملک بھی مسلمان ہی ہوں گے، پھر سُود کی ناپاک آلائش درمیان میں کیوں رکھی جائے؟

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس اقتباس میں کتنا حصّہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کا ہے اور کتنا حصہ، الجامعہ کا۔ لیکن اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں:-

سرمایہ لگانے والے ممالک کو سُود نہیں۔ منافع ملے گا۔ اور یوں یہ کاروبار سود کی ناپاک آلائش سے پاک اور صاف ہو جائے گا۔

یعنی سُود کا نام منافع رکھ لینے سے یہ سارا کاروبار اسلامی ہو جائے گا ـــــ خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی!! ہمیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ میں مضاربت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور مضاربت کے معنی ہوتے ہیں۔ (SLEEPING PARTNERSHIP) یعنی ایک شخص کاروبار کرتا ہے اور دوسرا اُس میں کچھ روپیہ لگا دیتا ہے۔ اور اس کا منافع دونوں بانٹ لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ محض روپیہ لگانے والے کا یہ منافع، اس کے سرمایہ پر بڑھوتری (اضافہ) ہے، جسے قرآن الربوٰ کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں (ربوٰ حرام ہے اور مضاربت حلال۔ (اُسی طرح جس طرح مزارعت یعنی زمین کی پیداوار کی بٹائی حلال قرار دی جاتی ہے۔) ـــ یہی مضاربت ہے جس کے مطابق مجوزہ "اسلامی" بینک سے حاصل ہونے والا منافع، جائز قرار پائے گا۔ اِس سے ہم اپنے آپ کو تو بے شک فریب دے لیں گے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کو کس طرح مطمئن کریں گے کہ یہ سُود نہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہوگا کہ سُود میں منافع کی شرح متعین ہوگی، اور اسلامی بینک کی شرح غیر متعیّن ـــــ اور کہا یہ گیا ہے کہ اس کی مقدار، سُود کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی! بات تو تفصیل چاہتی ہے، لیکن اشارۃً اسے یوں سمجھئے کہ آپ کسی غریب محنت کش کو سو روپیہ قرض دیتے ہیں، اور اُس سے دس روپے زائد وصول کرتے ہیں۔ اسے سُود کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ دس روپے آپ اُس مزدور کی محنت کی کمائی میں سے لیتے ہیں۔

دوسری طرف، بینک ایک صنعت کار کو قرضہ دیتا ہے جس سے وہ کارخانہ لگاتا ہے۔ اس سے وہ منافع حاصل کرتا ہے جس میں سے کچھ خود رکھ لیتا ہے۔ کچھ بینک کو دے دیتا ہے۔ بینک اُسے حصّہ داروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ زائد روپیہ آیا کہاں سے؟ ظاہر ہے کہ یہ، اُن محنت کشوں کی کمائی میں سے لیا گیا ہے جو اس کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ دونوں صورتوں میں زائد روپیہ، محنت کشوں کی کمائی میں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ اب ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی اقدار پر مشتمل قرآنی ضابطے ہر دور اور ہر ملک کی معاشی، معیشتی اور اقتصادی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ سرمایہ مسلمان ممالک کا ہوگا۔ اس سے استفادہ کرنے والے ملک بھی مسلمان ہی ہوں گے، پھر سُود کی ناپاک آلائش درمیان میں کیوں رکھی جائے؟

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس اقتباس میں کتنا حصّہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کا ہے اور کتنا حصہ، الجامعہ کا۔ لیکن اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں:-

سرمایہ لگانے والے ممالک کو سُود نہیں۔ منافع ملے گا۔ اور یوں یہ کاروبار سود کی ناپاک آلائش سے پاک اور صاف ہو جائے گا۔

یعنی سُود کا نام منافع رکھ لینے سے یہ سارا کاروبار اسلامی ہو جائے گا ـــــ خیر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی!! ہمیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ میں مضاربت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور مضاربت کے معنی ہوتے ہیں۔ (SLEEPING PARTNERSHIP) یعنی ایک شخص کاروبار کرتا ہے اور دوسرا اُس میں کچھ روپیہ لگا دیتا ہے۔ اور اس کا منافع دونوں بانٹ لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ محض روپیہ لگانے والے کا یہ منافع، اس کے سرمایہ پر بڑھوتری (اضافہ) ہے، جسے قرآن الربوٰ کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ربوٰ حرام ہے اور مضاربت حلال۔ (اُسی طرح جس طرح مزارعت یعنی زمین کی پیداوار کی بٹائی حلال قرار دی جاتی ہے۔) ـــ یہی مضاربت ہے جس کے مطابق مجوزہ "اسلامی" بینک سے حاصل ہونے والا منافع، جائز قرار پائے گا۔ اِس سے ہم اپنے آپ کو تو بے شک فریب دے لیں گے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کو کس طرح مطمئن کریں گے کہ یہ سُود نہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہوگا کہ سُود میں منافع کی شرح متعین ہوگی، اور اسلامی بینک کی شرح غیر متعیّن ـــــ اور کہا یہ گیا ہے کہ اس کی مقدار، سُود کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی! بات تو تفصیل چاہتی ہے، لیکن اشارۃً اسے یوں سمجھئے کہ آپ کسی غریب محنت کش کو سو روپیہ قرض دیتے ہیں، اور اُس سے دس روپے زائد وصول کرتے ہیں۔ اسے سُود کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ دس روپے آپ اُس مزدور کی محنت کی کمائی میں سے لیتے ہیں۔

دوسری طرف، بینک ایک صنعت کار کو قرضہ دیتا ہے جس سے وہ کارخانہ لگاتا ہے۔ اس سے وہ منافع حاصل کرتا ہے جس میں سے کچھ خود رکھ لیتا ہے۔ کچھ بینک کو دے دیتا ہے۔ بینک اُسے حصّہ داروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ زائد روپیہ آیا کہاں سے؟ ظاہر ہے کہ یہ، اُن محنت کشوں کی کمائی میں سے لیا گیا ہے جو اس کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ دونوں صورتوں میں زائد روپیہ، محنت کشوں کی کمائی میں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اب اِس کی ایک (پہلی انفرادی) شکل کو حرام قرار دے دینا اور دوسری (اجتماعی) شکل کو حلالِ طیب، خود فریبی یا خدا فریبی نہیں تو اور کیا ہے! یاد رکھئے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معاوضہ محنت (کام کرنے) کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربٰوا ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھئے!

۱۔ ہمارے ہاں جس قدر اصطلاحات مروّج ہیں، جب تک ہم ان کے معانی (DEFINITION) قرآنِ کریم کی رُو سے متعین نہیں کرتے، یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کونسی چیز جائز ہے اور کونسی ناجائز ـــــ اور

۲۔ ربٰوا سے پاک اور صاف کاروبار، محض ایک بینک قائم کر دینے سے ممکن نہیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہمارا پورے کا پورا معاشی نظام قرآن کے مطابق متشکل ہوگا۔

۴۔ دُنیا کا نرالا چڑیا گھر

ہفت روزہ ایشیا کی ۹ مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، "کاغان کی چوٹیوں سے لے کر مکران کے ساحل تک سے آئے ہوئے وکلاء کے عظیم اجتماع کل پاکستان کنونشن" کی روئداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے، جماعتِ اسلامی کے پارلیمانی لیڈر، پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب نے فرمایا:۔

> چونکہ میں قانون کے مقدّس پیشے سے متعلق نہیں۔ میں نے اس آئین پر دستخط ثبت کئے ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے معیار پر پورا نہیں اترتا اس لئے مجھے اس اجلاس میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا ہے۔

یعنی بڑے میاں (مودودی صاحب) وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیتے ہیں، اور یہ حضرت اسے مقدّس پیشہ فرماتے ہیں! دوسرے یہ کہ اس جماعت نے برسوں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ موجودہ آئین کو اسلامی بنانے کا سہرا اس جماعت کے سر ہے۔ اور اب پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ، انہوں نے ایک ایسے آئین پر دستخط کئے ہیں جو اسلامی معیار پر پورا نہیں اترتا! یہ عجیب قسم کا چڑیا گھر ہے، جس میں ایک ہی نوع کا ہر جانور الگ الگ بولی بولتا ہے۔

(ضمناً) ایسا نظر آتا ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے الیکشن منشور میں یہ شق بھی رکھے گی کہ وہ موجودہ "غیر اسلامی" آئین کو اسلامی معیار کے مطابق متشکل کرے گی۔

> جھونکتے جاؤ: قوم کی آنکھوں میں دھول کہ آپ کے آقا یانِ نعمت کا یہی فرمان ہے۔

اب اس کی ایک (پہلی انفرادی) شکل کو حرام قرار دے دینا اور دوسری (اجتماعی) شکل کو حلالِ طیب، خود فریبی یا خدا فریبی نہیں تو اور کیا ہے! یاد رکھئے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معاوضہ محنت (کام کرنے) کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربوٰ ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھئے!

۱۔ ہمارے ہاں جس قدر اصطلاحات مروّج ہیں، جب تک ہم ان کے معانی (DEFINITION) قرآنِ کریم کی رُو سے متعین نہیں کرتے، یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کونسی چیز جائز ہے اور کونسی ناجائز ـــــ اور

۲۔ ربوٰ سے پاک اور صاف کاروبار، محض ایک بینک قائم کر دینے سے ممکن نہیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہمارا پورے کا پورا معاشی نظام قرآن کے مطابق متشکل ہوگا۔

۴۔ دُنیا کا نرالا چڑیا گھر

ہفت روزہ ایشیا کی ۹ مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، "کاغان کی چوٹیوں سے لے کر مکران کے ساحل تک سے آئے ہوئے وکلاء کے عظیم اجتماع کل پاکستان کنونشن" کی روئداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے، جماعتِ اسلامی کے پارلیمانی لیڈر، پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب نے فرمایا:۔

> چونکہ میں قانون کے مقدّس پیشے سے متعلق نہیں۔ پھر میں نے اس آئین پر دستخط ثبت کئے ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے معیار پر پورا نہیں اترتا اس لئے مجھے اس اجلاس میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا ہے۔

یعنی بڑے میاں (مودودی صاحب) وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیتے ہیں، اور یہ حضرت اسے مقدّس پیشہ فرماتے ہیں! دوسرے یہ کہ اس جماعت نے برسوں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ موجودہ آئین کو اسلامی بنانے کا سہرا اس جماعت کے سر ہے۔ اور اب پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ، انہوں نے ایک ایسے آئین پر دستخط کئے ہیں جو اسلامی معیار پر پورا نہیں اترتا! یہ عجیب قسم کا چڑیا گھر ہے، جس میں ایک ہی نوع کا ہر جانور الگ الگ بولی بولتا ہے۔

(ضمناً) ایسا نظر آتا ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے الیکشن منشور میں یہ شق بھی رکھے گی کہ وہ موجودہ "غیر اسلامی" آئین کو اسلامی معیار کے مطابق متشکل کرے گی۔

> جھونکتے جاؤ دھول قوم کی آنکھوں میں دھول کہ آپ کے آقا یانِ نعمت کا یہی فرمان ہے۔

۵۔ نظریۂ پاکستان کس نے دیا تھا؟

یوں تو وہ کونسا دن ہے جب ہمیں عصرِ حاضر کے "صالحین" کی طرف سے ہدفِ سب و شتم نہیں بننا پڑتا۔ لیکن طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ لوگ بوکھلا اُٹھے ہیں ـــــ حالانکہ اس میں پردہ یونہی سرکایا گیا ہے۔ اگر پورا نقاب اُٹھ گیا تو خدا جانے ان کی حالت کیا ہو جائے گی؛ پہلے یہ حضرات گمنام چٹھیاں لکھا کرتے تھے لیکن اب زیادہ زور ٹیلیفونوں پہ ہے۔ ہم نے سابقہ پرچہ میں لکھا تھا کہ میاں طفیل محمدؐ صاحب کا یہ بیان کہ نظریۂ پاکستان مودودی صاحب نے دیا تھا، کذب و افترا ہے۔ اس سے یہ لوگ بہت زیادہ سیخ پا ہوئے ہیں ـــــ ہم سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ اگر یہ نظریہ مودودی نے نہیں دیا تھا، تو اور کس نے دیا تھا؟ ہم اُن کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جس پرچہ (بابت جون) میں یہ لکھا گیا ہے کہ میاں صاحب کا یہ بیان کذب و افترا ہے، اسی کے صفحہ ۱۶ پر آپ کے اس سوال کا جواب بھی موجود ہے کہ یہ نظریہ کس نے دیا تھا۔ اور وہ جواب ہے خود، آپ کے پیرو مرشد، مودودی صاحب کی طرف سے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا اور قائدِاعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔ (ایشیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء)

آپ نے دیکھ لیا کہ نظریۂ پاکستان کس نے دیا تھا؟

لیکن یہ ٹولہ بھی عجیب ہے ـــــ یکے دزد باشد دگر پردہ دار ـــــ امیر جماعتِ اسلامی (میاں طفیل محمدؐ) فرماتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان مودودی صاحب نے دیا تھا۔ مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ لیکن وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور کسی سے نہیں کہتے کہ میاں صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ نہ ہی میاں صاحب کسی معذرت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان کے اکابرین کی یہ کیفیت ہو تو اصاغرین میں سے کس کی جرأت ہے کہ وہ کہہ دے کہ جھوٹ بولا گیا ہے!

خط و کتابت کرتے وقت، اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر ہو جاتی ہے ـــــ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط لکھئے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

۵۔ نظریۂ پاکستان کس نے دیا تھا؟

یوں تو وہ کونسا دن ہے جب ہمیں عصرِ جدید کے "صالحین" کی طرف سے ہدفِ سب و شتم نہیں بننا پڑتا۔ لیکن طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ لوگ بوکھلا اُٹھے ہیں ـــــ حالانکہ اس میں پردہ یونہی سرکایا گیا ہے۔ اگر پورا نقاب اُٹھ گیا تو خدا جانے ان کی حالت کیا ہو جائے گی؟ پہلے یہ حضرات گمنام چٹھیاں لکھا کرتے تھے لیکن اب زیادہ زور ٹیلیفونوں پر ہے۔ ہم نے سابقہ پرچہ میں لکھا تھا کہ میاں طفیل محمدؒ صاحب کا یہ بیان کہ نظریۂ پاکستان مودودی صاحب نے دیا تھا، کذب و افترا ہے۔ اس سے یہ لوگ بہت زیادہ سیخ پا ہوئے ہیں ـــــ ہم سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ اگر یہ نظریہ مودودی نے نہیں دیا تھا، تو اور کس نے دیا تھا؟ ہم اُن کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جس پرچہ (بابت جون) میں یہ لکھا گیا ہے کہ میاں صاحب کا یہ بیان کذب و افترا ہے، اسی کے صفحہ پر آپ کے اس سوال کا جواب بھی موجود ہے کہ یہ نظریہ کس نے دیا تھا۔ اور وہ جواب ہے خود، آپ کے پیر و مرشد، مودودی صاحب کی طرف سے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا اور قائداعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔ (ایشیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء)

آپ نے دیکھ لیا کہ نظریۂ پاکستان کس نے دیا تھا؟

لیکن یہ ٹولہ بھی عجیب ہے ـــــ یکے دزد باشد دگر پردہ دار ـــــ امیر جماعتِ اسلامی (میاں طفیل محمدؒ) فرماتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان مودودی صاحب نے دیا تھا۔ مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ لیکن وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور کسی سے نہیں کہتے کہ میاں صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ نہ ہی میاں صاحب کسی معذرت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان کے اکابرین کی یہ کیفیت ہو تو اصاغرین میں سے کس کی جرأت ہے کہ وہ کہہ دے کہ جھوٹ بولا گیا ہے!

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر ہو جاتی ہے ـــــ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط لکھئے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

صحابہؓ کبار اور جماعتِ اسلامی

"درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"

اس مقولہ نے قریب قریب ساری دنیا میں ایک مسلمہ کی سی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ یوں تو اس کا اطلاق ہر معلّم اور مربّی (تربیت کرنے والے) پر ہوتا ہے۔ لیکن آسمانی دعوتِ انقلاب کے ..... داعیان (حضرات انبیاء کرامؑ) کے سلسلہ میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ داعی اپنے پیغام کو عام کرتے تھے، اور جو لوگ اسے بہ صدق و صفا قبول کر لیتے تھے۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے ــــ یہی وہ "پھل" تھے جن سے پہچانا جاتا تھا کہ اس داعی کی تعلیم و تربیت کیسی تھی۔ یہی حضرات اپنے انسانیت ساز مشن کی صداقت کی زندہ شہادت قرار پاتے تھے۔ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، اس کی تعلیم اور پیغام کے مخالفین و معاندین، اس کے مشن کو جھوٹا اور ناکام ثابت کرنے کے لئے ایک سازش کرتے، یعنی وہ تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے جس سے اس داعی کے تربیت اور صحبت یافتگان کا کردار نہایت داغدار ہو کر سامنے آئے۔ اس سازش کے بعد انہیں اس داعی اور اس کی تعلیم کے خلاف کچھ اور کہنے اور کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ وہ دنیا سے کہتے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ سو جس درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کے شجرِ طیّب یا خبیث ہونے کے متعلق آپ خود فیصلہ کر لیجئے۔ حضور نبی اکرمؐ سے پہلے، سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی حضرت عیسےٰؑ تھے۔ ان کے خلاف (خود انہی کے نام نہاد متبعین میں سے بعض نے) اسی قسم کی سازش کی۔ انہوں نے، اس دور کی تاریخ (انجیل) کو مسخ کیا اور یہ ثابت کیا کہ حضرت عیسےٰؑ کے کل بارہ (۱۲) تربیت یافتہ، حواری تھے۔ ان میں سے ایک نے تو آپ کو چند پیسوں کے عوض، پولیس کے حوالے کر دیا اور باقی گیارہ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کے خلاف کچھ کہنے کی، ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ سازش ایسی خطرناک اور اس کے نتائج ایسے دور رس تھے کہ خود اللہ تعالےٰ کو اس کی تردید کرنی پڑی۔ اس نے (قرآن کریم میں) کہا کہ حضرت عیسےٰؑ کے تربیت یافتگان اس قسم کے پست کردار کے حامل نہیں تھے۔ ان کی بلندیٔ سیرت کا تو یہ عالم تھا کہ جب حضرت عیسےٰؑ نے اپنے مخالفین کی طرف سے خطرہ محسوس کیا تو اپنی جماعت کے افراد سے کہا کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ ــــ "کون ہے جو خدا کے مشن کی تکمیل کے لئے میرا مددگار بنتا ہے"؟ تو قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ۔

صحابہؓ کبارؓ اور جماعتِ اسلامی

"درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"

اس مقولہ نے قریب قریب ساری دنیا میں ایک مسلمہ کی سی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ یوں تو اس کا اطلاق ہر معلّم اور مربّی (تربیت کرنے والے) پر ہوتا ہے۔ لیکن آسمانی دعوتِ انقلاب کے ..... داعیان (حضرات انبیاء کرامؑ) کے سلسلہ میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ داعی اپنے پیغام کو عام کرتے تھے، اور جو لوگ اسے بہ صدق و صفا قبول کر لیتے تھے۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے — یہی وہ "پھل" تھے جن سے پہچانا جاتا تھا کہ اس داعی کی تعلیم و تربیت کیسی تھی۔ یہی حضرات اپنے انسانیت ساز مشن کی صداقت کی زندہ شہادت قرار پاتے تھے۔ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، اس کی تعلیم اور پیغام کے مخالفین و معاندین، اس کے مشن کو جھوٹا اور ناکام ثابت کرنے کے لئے ایک سازش کرتے، یعنی وہ تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے جس سے اس داعی کے تربیت اور صحبت یافتگان کا کردار نہایت داغدار ہو کر سامنے آئے۔ اس سازش کے بعد انہیں اس داعی اور اس کی تعلیم کے خلاف کچھ اور کہنے اور کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ وہ دنیا سے کہتے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ سو جس درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کے شجرِ طیّب یا خبیث ہونے کے متعلق آپ خود فیصلہ کر لیجئے۔ حضور نبی اکرمؐ سے پہلے، سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی حضرت عیسےٰؑ تھے۔ ان کے خلاف (خود انہی کے نام نہاد متبعین میں سے بعض نے) اسی قسم کی سازش کی۔ انہوں نے، اس دور کی تاریخ (انجیل) کو مسخ کیا اور یہ ثابت کیا کہ حضرت عیسےٰؑ کے کل بارہ (۱۲) تربیت یافتہ، حواری تھے۔ ان میں سے ایک نے تو آپ کو چند پیسوں کے عوض، پولیس کے حوالے کر دیا، اور باقی گیارہ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کے خلاف کچھ کہنے کی، ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ سازش ایسی خطرناک اور اس کے نتائج ایسے دور رس تھے کہ خود اللہ تعالےٰ کو اس کی تردید کرنی پڑی۔ اس نے (قرآن کریم میں) کہا کہ حضرت عیسےٰؑ کے تربیت یافتگان اس قسم کے پست کردار کے حامل نہیں تھے۔ ان کی بلندیٔ سیرت کا تو یہ عالم تھا کہ جب حضرت عیسےٰؑ نے اپنے مخالفین کی طرف سے خطرہ محسوس کیا تو اپنی جماعت کے افراد سے کہا کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ — "کون ہے جو خدا کے مشن کی تکمیل کے لئے میرا مددگار بنتا ہے"؟ تو قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵۲) "حواریوں نے کہا کہ ہم آپ کے ساتھی اور مددگار ہیں"۔ اور پھر انہوں نے حضرت عیسےٰ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ چنانچہ ان کے اس بلند کردار کو، قرآنِ کریم نے خود جماعتِ مومنین کیلئے قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا اور کہا کہ تم حضرت عیسےٰ کے حواریوں کی طرح انصار اللہ بن کر دکھانا۔ (۶۱/۱۴) قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو بیان ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کیا ہے کہ اس قسم کے شجرِ طیب (نبی یا رسول) کے ثمرات ایسے کڑوے، کسیلے نہیں ہوتے جیسے کہ عیسائیوں کی مسخ کردہ تاریخ نے انہیں پیش کیا ہے۔ وہ نہایت لطیف، شیریں اور خوشگوار ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ کا منصبِ رسالت یہ بھی بتایا کہ — وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ۔ (۲/۱۲۹) "وہ اپنے رفقاء کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور ان کی تربیتِ نفس کرتا ہے"۔ اس قسم کی تھی وہ جماعت جسے نبی اکرمؐ نے تیار فرمایا تھا۔ یہی اس شجرِ طیب کے ثمرِ شیریں تھے۔ انہیں قرآنِ کریم نے اجمالی طور پر "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۹/۸۸) یعنی "رسول اللہ کے ساتھی"۔ اور ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹) "وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت تھے اور باہمدگر نہایت ہمدرد"۔ انہی کو صحابہ کبارؓ کہا جاتا ہے۔ یعنی رسول اللہ کے ساتھی۔ حضورؐ کے دوست۔

انبیاءؑ سابقہ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق مسخ شدہ تاریخ کی تصحیح تو قرآنِ کریم نے کر دی، لیکن چونکہ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبیؐ، اور قرآن کے بعد کسی کتاب نے آنا نہیں تھا، اس لئے قرآنِ کریم نے ان اصحابِ رسولؐ کی سیرت و کردار کو خود اپنے اوراق میں محفوظ کر دیا تاکہ بعد میں کوئی ان کے پاکیزہ چہروں کو داغدار نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی سیرت کی شہادت (مسخ شدہ) تاریخ نہیں، بلکہ خود قرآن پیش کرے گا، اور تاریخ کا کوئی بیان جو قرآنی سند و شہادت کے خلاف ہوگا، اسے سازش سمجھا جائے گا۔

حضور نبی اکرمؐ نے قریب تیرہ سال تک، مکہ میں ان برگزیدہ افراد کی تعلیم و تربیت کی، اس کے بعد، جب حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ انہیں قرآنِ کریم نے مہاجرین کہہ کر پکارا ہے، اور مہاجرین میں سے بھی سابقین الاوّلین۔ سبقت کرنے والے۔

مدینہ کی جماعت کے افراد نے، ان مہاجرین کو دل و جان سے خوش آمدید کہا اور (قرآن کے الفاظ میں) انہیں خود اپنے پر ترجیح دے کر انہیں مدینہ میں بسایا۔ ان کی اس نصرت و حمایت کی بنا پر، قرآنِ کریم نے انہیں انصار کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ ہجرت کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ اور قرآنِ کریم نے ان مہاجرین کو، السابقون الاوّلون — "خلوص و صداقت سے اتباع کرنے والے" کہہ کر پکارا — متبعین باحسان (۹/۱۰۰)۔ یہ سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا، جب مکہ کے باقیماندہ باشندوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ (انہیں، قرآن کے الفاظ میں نہیں، بلکہ

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵۲) "حواریوں نے کہا کہ ہم آپ کے ساتھی اور مددگار ہیں"۔ اور پھر انہوں نے حضرت عیسےٰؑ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ چنانچہ ان کے اس مانند کردار کو، قرآن کریم نے خود جماعتِ مومنین کیلئے قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا اور کہا کہ تم حضرت عیسےٰؑ کے حواریوں کی طرح انصار اللہ بن کر دکھاؤ۔ (۶۱/۱۴) قرآن کریم نے اس واقعہ کو بیان ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کیا ہے کہ اس قسم کے شجرِ طیب (نبیؑ یا رسولؑ) کے ثمرات ایسے کڑوے کسیلے نہیں ہونے جیسے کہ عیسائیوں کی مسخ کردہ تاریخ نے انہیں پیش کیا ہے۔ وہ نہایت لطیف، شیریں اور خوشگوار ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کا منصبِ رسالت یہ بھی بتایا کہ — وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ۔ (۶۲/۲) "وہ اپنے رفقاء کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور ان کی تربیتِ نفس کرتا ہے"۔ اس قسم کی تھی وہ جماعت جسے نبی اکرمؐ نے تیار فرمایا تھا۔ یہی اس شجرِ طیب کے ثمرِ شیریں تھے۔ انہیں قرآن کریم نے اجمالی طور پر "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۴۸/۲۹) یعنی "رسول اللہ کے ساتھی"۔ اور ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹) "وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت تھے اور باہمدگر نہایت ہمدرد"۔ انہی کو صحابہ کبارؓ کہا جاتا ہے۔ یعنی رسول اللہ کے ساتھی۔ حضورؐ کے دوست۔

انبیاءؑ سابقہ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق مسخ شدہ تاریخ کی تصحیح تو قرآن کریم نے کر دی لیکن چونکہ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبیؑ، اور قرآن کے بعد کسی کتاب نے آنا نہیں تھا، اس لئے قرآن کریم نے ان اصحابِ رسولؐ کی سیرت و کردار کو خود اپنے اوراق میں محفوظ کر دیا تاکہ بعد میں کوئی ان کے پاکیزہ چہروں کو داغدار نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی سیرت کی شہادت (مسخ شدہ) تاریخ نہیں، بلکہ خود قرآن پیش کرے گا، اور تاریخ کا کوئی بیان جو قرآنی سند و شہادت کے خلاف ہوگا، اسے سازش سمجھا جائے گا۔

حضور نبی اکرمؐ نے قریب تیرہ سال تک، مکہ میں ان برگزیدہ افراد کی تعلیم و تربیت کی، اس کے بعد، جب حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ انہیں قرآن کریم نے مہاجرین کہہ کر پکارا ہے، اور مہاجرین میں سے بھی سابقین الاوّلین۔ سبقت کرنے والے۔

مدینہ کی جماعت کے افراد نے، ان مہاجرین کو دل و جان سے خوش آمدید کہا اور (قرآن کے الفاظ میں) انہیں خود اپنے پر ترجیح دے کر انہیں مدینہ میں بسایا۔ ان کی اس نصرت و حمایت کی بنا پر، قرآن کریم نے انہیں انصار کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ ہجرت کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ اور قرآن کریم نے ان مہاجرین کو، السابقون الاوّلون — "خلوص و صداقت سے اتباع کرنے والے" کہہ کر پکارا — متبعین باحسان (۹/۱۰۰)۔ یہ سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا، جب مکہ کے باقیماندہ باشندوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ (انہیں، قرآن کے الفاظ میں نہیں، بلکہ

تاریخ کے الفاظ ہیں، طلقا کہہ کر پکارا جاتا ہے، یعنی جنہیں جنگ کے بعد آزاد کیا گیا تھا۔) قرآن کریم نے ان گروہوں کا الگ الگ، ان حسین و جمیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:-

صحابہؓ کبار اور قرآن کریم

(۱) وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا (مہاجرین و مجاہدین) اور جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومنون حقا) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور نہایت باعزت رزق۔ (۸/۷۴)

(۲) مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی تھی (السابقون الاولون) اور جنہوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا۔ اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے ان کے لئے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے پانی (ذریعہ شادابی) رواں دواں رہتا ہے۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۹/۱۰۰)

دوسرے مقام پر کہا کہ أُولَٰئِكَ مِنكُمْ (۸/۷۵) یہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔

(۳) وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے تو یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں۔ السابقون الاولون کے مدارج بے شک بلند ہیں۔ لیکن خدا کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ (اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی)۔

یہ تھی رسول اللہؐ کے ساتھیوں کی وہ جماعت جن کے متعلق کہا کہ "خدا وہ ہے جس نے، اے رسولؐ!... اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تمہاری تقویت اور تائید کا موجب بنایا" (۸/۶۲)۔ "لہذا" تیرے لئے، اللہ اور یہ جماعت، جس نے تیرا اتباع کیا ہے، کافی ہے"

ان قرآنی تصریحات سے واضح ہے کہ، جو خوش بخت افراد، حضورؐ کی دعوت کے یوم اوّل سے حیاتِ نبویؐ کے آخری لمحات تک، ایمان لائے، ان کا شمار مندرجہ بالا زمروں میں ہوتا ہے اور ان کے مومن ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ یعنی قرآن کریم نے مومنین کی جو صفات بیان کی ہیں یہ ان سے متصف تھے۔

قرآن کریم نے البتہ اس کی تخصیص کر دی ہے کہ اعراب (بدوؤں) میں سے ایسے قبائل تھے جن کے ایمان ناپختہ تھے۔ انہی میں وہ بھی تھے جنہیں قرآن نے منافقین کہہ کر پکارا ہے۔ (۹/۱۰۱)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ایمان و عمل کی شہادت کو خود اپنی کتاب میں اس لئے محفوظ کر دیا کہ اسے معلوم تھا کہ (جس طرح انبیاءؑ سابقہ کے ساتھیوں سے ہوا ہے) تاریخ کو مسخ کر کے، رسول اللہؐ کے ساتھیوں کی سیرت کو بھی داغدار کیا جائے گا" تاکہ دنیا سے کہا جائے کہ جس

تاریخ کے الفاظ ہیں، طلقا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی جنہیں جنگ کے بعد آزاد کیا گیا تھا۔) قرآن کریم نے ان گروہوں کا الگ الگ، ان حسین و جمیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

صحابہؓ کبار اور قرآن کریم

(۱) وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا (مہاجرین و مجاہدین) اور جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومنون حقا) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور نہایت باعزت رزق۔ (۸/۷۴)

(۲) مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی تھی (السابقون الاولون) اور جنہوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا۔ اللہ ان سب سے راضی ہوگیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے ان کے لئے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے پانی (ذریعہ شادابی) رواں دواں رہتا ہے۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۹/۱۰۰)

دوسرے مقام پہ کہا کہ اُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸/۷۵) یہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔

(۳) وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے تو یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں۔ السابقون الاولون کے مدارج بے شک بلند ہیں۔ لیکن خدا کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ (اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی)۔

یہ تھی رسول اللہ کے ساتھیوں کی وہ جماعت جن کے متعلق کہا کہ "خدا وہ ہے جس نے، اے رسولؐ!... اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تمہاری تقویت اور تائید کا موجب بنایا" (۸/۶۲)۔ لہٰذا "تیرے لئے، اللہ اور یہ جماعت، جس نے تیرا اتباع کیا ہے، کافی ہے"

ان قرآنی تصریحات سے واضح ہے کہ، جو خوش بخت افراد، حضورؐ کی دعوت کے یوم اوّل سے حیاتِ نبویؐ کے آخری لمحات تک، ایمان لائے، ان کا شمار مندرجہ بالا زمروں میں ہوتا ہے اور ان کے مومن ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ یعنی قرآن کریم نے مومنین کی جو صفات بیان کی ہیں یہ ان سے متصف تھے۔

قرآن کریم نے البتہ اس کی تخصیص کر دی ہے کہ اعراب (بدوؤں) میں سے ایسے قبائل تھے جن کے ایمان ناپختہ تھے۔ انہی میں وہ بھی تھے جنہیں قرآن نے منافقین کہہ کر پکارا ہے۔ (۹/۹۴)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ایمان و عمل کی شہادت کو خود اپنی کتاب میں اس لئے محفوظ کر دیا کہ اسے معلوم تھا کہ (جس طرح انبیاءؑ سابقہ کے ساتھیوں سے ہوا ہے) تاریخ کو مسخ کر کے، رسول اللہ کے ساتھیوں کی سیرت کو بھی داغدار کیا جائے گا" تاکہ دنیا سے کہا جائے کہ جس

درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کی صداقت کے متعلق تم خود اندازہ لگا لو!

مسخ شدہ تاریخ

چنانچہ ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ اسے اس قدر مسخ کیا گیا کہ اس میں ان صحابہؓ رسول اللہ کی سیرت و کردار نہایت گھناؤنی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ہمارے لئے، مخالفین اسلام اور معاندینِ حضور رسالتمآبؐ کے خلاف اس سازش سے محفوظ رہنے کا طریق نہایت آسان تھا۔ اس کے لئے ہمیں کہنا یہ چاہیئے تھا کہ ان حضراتؓ کے متعلق تاریخ میں جو کچھ ایسا لکھا ملتا ہے، جو ایک مومن کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا، وہ وضع کردہ ہے۔ اسے ہم مسترد کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان، قرآنی شہادات پر ہے، تاریخی تحریفات پر نہیں۔ لیکن ہم میں پہلے بھی ایسے لوگ موجود رہے جنہوں نے اس مسخ شدہ تاریخ کو قرآنی شہادات پر ترجیح دی اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مخالفین کی اس سازش کو کامیاب بنانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ تاریخ کے یہ واقعات سچے ہیں اور قرآن کی شہادات (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتماد ــــــ ہمارے زمانے میں مودودی صاحب کا نام، ان میں سرفہرست آتا ہے۔ یہ صاحب، اس مسخ شدہ تاریخ سے چن چن کر ایسے واقعات نکالتے ہیں جن سے صحابہ کبارؓ (بشمول خلفائے راشدینؓ) کی سیرت داغدار ہوتی ہو، اور اسے اپنے مضامین اور تقاریر میں اچھال اچھال کر پیش کرتے ہیں۔ (یہ صاحب تو نعوذ باللہ حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس تک کو نہیں بخشتے۔ لیکن یہ موضوع الگ ہے۔) پہلے یہ، مختلف مقالات و رسائل میں ایسا کرتے رہے اور بعد ازاں، اس موضوع پر ایک مستقل کتاب شائع کر دی ــــــ خلافت و ملوکیت ــــــ ہم دل پر پتھر رکھ کر، ان میں سے دو چار مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں ــــــ جس مقصد کے لئے ہم نے یہ طویل تمہید سپردِ قلم کی ہے، وہ اس کے بعد سامنے آئے گا۔

مودودی صاحب اور صحابہؓ کرام

مودودی صاحب اپنی اس ایمان سوز مہم کا آغاز، خود حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران سے کرتے ہیں، وہ "خلافت و ملوکیت" (صفحہ ۱۰۹ پر) لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد، حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے۔ وہ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے اور حضورؐ کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کے مرتکب تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر "حضورؐ نے جن لوگوں کے متعلق اعلان فرمایا تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں میں بھی چھپے ہوئے ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے، ان میں یہ بھی شامل تھے"۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے انہیں اپنے پاس چھپا لیا اور جب مکہ میں امن امان ہو گیا تو:

> حضرت عثمانؓ ان کو لے کر حضورؐ کے سامنے پہنچ گئے اور ان کے لئے عفوِ تقصیر کی درخواست کرتے ہوئے گزارش کی کہ ان کی بیعت قبول فرمالیں۔ حضورؐ خاموش رہے حتیٰ کہ تین مرتبہ ان کی درخواست پر خاموش رہنے کے بعد آپ نے ان سے بیعت لے لی۔

درخت کے پھل ایسے ہوں، اس کی صداقت کے متعلق تم خود اندازہ لگا لو!

مسخ شدہ تاریخ

چنانچہ ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ اسے اس قدر مسخ کیا گیا کہ اس میں ان صحابہؓ رسول اللہ کی سیرت و کردار نہایت گھناؤنی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ہمارے لئے، مخالفینِ اسلام اور معاندینِ حضور رسالتمآبؐ کے خلاف اس سازش سے محفوظ رہنے کا طریق نہایت آسان تھا۔ اس کے لئے ہمیں کہنا یہ چاہیئے تھا کہ ان حضراتؓ کے متعلق تاریخ میں جو کچھ ایسا لکھا ملتا ہے، جو ایک مومن کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا، وہ وضع کردہ ہے۔ اسے ہم مسترد کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان، قرآنی شہادات پر ہے، تاریخی تحریفات پر نہیں۔ لیکن ہم میں پہلے بھی ایسے لوگ موجود رہے جنہوں نے اس مسخ شدہ تاریخ کو قرآنی شہادات پر ترجیح دی اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مخالفین کی اس سازش کو کامیاب بنانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کا مسلک، یہ ہے کہ تاریخ کے یہ واقعات سچے ہیں اور قرآن کی شہادات (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتماد ——— ہمارے زمانے میں مودودی صاحب کا نام، ان میں سرِفہرست آتا ہے۔ یہ صاحب، اس مسخ شدہ تاریخ سے چن چن کر ایسے واقعات نکالتے ہیں جن سے صحابہ کبارؓ (بشمولِ خلفائے راشدینؓ) کی سیرت داغدار ہوتی ہو، اور اسے اپنے مضامین اور تقاریر میں اچھال اچھال کر پیش کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اور صحابہؓ کرام

(یہ صاحب تو نعوذ باللہ حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس تک کو نہیں بخشتے۔ لیکن یہ موضوع الگ ہے۔) پہلے یہ، مختلف مقالات و رسائل میں ایسا کرتے رہے اور بعد ازاں، اس موضوع پر ایک مستقل کتاب شائع کر دی ——— خلافت و ملوکیت ——— ہم دل پر پتھر رکھ کر، ان میں سے دو چار مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں ——— جس مقصد کے لئے ہم نے یہ طویل تمہید سپردِ قلم کی ہے، وہ اس کے بعد سامنے آئے گا۔

مودودی صاحب اپنی اس ایمان سوز مہم کا آغاز، خود حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران سے کرتے ہیں، وہ "خلافت و ملوکیت" (صفحہ پر) لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد، حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے۔ وہ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے اور حضورؐ کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کے مرتکب تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر "حضورؐ نے جن لوگوں کے متعلق اعلان فرمایا تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں میں بھی چھپے ہوئے ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے، ان میں یہ بھی شامل تھے" ——— لیکن حضرت عثمانؓ نے انہیں اپنے پاس چھپا لیا اور جب مکہ میں امن امان ہو گیا تو:

> حضرت عثمانؓ ان کو لے کر حضورؐ کے سامنے پہنچ گئے اور ان کے لئے عفو تقصیر کی درخواست کرتے ہوئے گزارش کی کہ ان کی بیعت قبول فرمالیں۔ حضورؐ خاموش رہے حتیٰ کہ تین مرتبہ ان کی درخواست پر خاموش رہنے کے بعد آپ نے ان سے بیعت لے لی۔

اور پھر صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ تم میں کوئی ایسا بھلا آدمی نہ تھا کہ جب میں بیعت نہیں لے رہا تھا تو وہ اُٹھ کر انہیں قتل کر دیتا۔ عرض کیا گیا کہ ہم آپؐ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ آنکھ سے خفیہ اشارے کرے۔

آپ دیکھیے کہ "خلافت و ملوکیت" کے مؤلف نے ایک تیر سے کتنے جگر شگاف کر دیئے۔ یعنی :-

(۱) جس شخص کے متعلق حضورؐ نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں میں بھی چھپ جائے تو بھی اسے قتل کر دیا جائے، حضرت عثمانؓ اسے اپنے ہاں چھپائے رکھتے ہیں۔ کیا معصیتِ رسولؐ کی اس سے زیادہ نمایاں مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ —— اس معصیتِ رسولؐ کی مثال جس کی سزا (قرآنِ کریم کی رو سے) جہنم ہے!

(۲) حضرت عثمانؓ کی درخواستِ عفو پر حضورؐ خاموش رہتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضورؐ اسے پسند نہیں فرماتے۔ لیکن حضرت عثمانؓ اس کے باوجود، اپنی درخواست پر اصرار کئے جاتے ہیں! سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہا جائے!

(۳) رسول اللہؐ دل سے چاہتے ہیں کہ اس شخص کو قتل کر دیا جائے، لیکن زبان سے ایسا نہیں کہتے۔ سوچیے کہ اس سے خود ذاتِ رسالتمآبؐ کا کس قسم کا کردار سامنے آتا ہے؟ (معاذاللہ ثم معاذاللہ)

(۴) حضورؐ صحابہ کرامؓ کو ڈانٹتے ہیں کہ جب میں نے اس قسم کا انداز اختیار کر رکھا تھا تو تم نے اس شخص کو قتل کیوں نہ کر دیا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اگر آپؐ زبان سے ایسا نہیں کہنا چاہتے تھے، تو کم از کم آنکھ ہی سے اس قسم کا اشارہ کر دیتے! اور آپؐ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ نبیؐ اشارے نہیں کیا کرتا! یعنی حضورؐ یہ بات نہ زبان سے کہتے ہیں، نہ اشارہ کرتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ آپؐ کے صحابہؓ خود ہی حضورؐ کا عندیہ سمجھ جائیں اور اس شخص کو قتل کر دیں۔ (استغفراللہ) ——

حالانکہ یہی صاحب (مودودی صاحب) دوسری جگہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ جب حضورؐ نے اپنے بعض صحابہؓ کو کعب بن اشرف کے قتل کرنے کی مہم پر روانہ فرمایا تو انہیں اجازت دی کہ اگر ضرورت پڑے تو تم جھوٹ سے بھی کام لے لینا۔ اور انہوں نے (توبہ۔توبہ) نہایت فریب کارانہ انداز سے اُسے قتل کر دیا۔ (ترجمان القرآن۔ بابت، مئی ۱۹۵۸ء)

✲

مودودی صاحب اور حضرت عثمانؓ

یہ تھا (مودودی صاحب کے نزدیک) حضرت عثمانؓ کا کردار، رسول اللہؐ کی زندگی میں۔ اس کے بعد جب حضرت عثمانؓ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو کیا ہوا، اسے غور سے سنیئے۔ لکھتے ہیں :-

ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت

اور پھر صحابہ کرام رضؓ سے فرمایا کہ تم میں کوئی ایسا بھلا آدمی نہ تھا کہ جب میں بیعت نہیں لے رہا تھا تو وہ اُٹھ کر انہیں قتل کر دیتا۔ عرض کیا گیا کہ ہم آپؐ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ آنکھ سے خفیہ اشارے کرے۔

آپ دیکھئے کہ "خلافت و ملوکیت" کے مؤلف نے ایک تیر سے کتنے جگر شگاف کر دیئے۔ یعنی :۔

(۱) جس شخص کے متعلق حضورؐ نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں میں بھی چھپ جائے تو بھی اسے قتل کر دیا جائے، حضرت عثمانؓ اسے اپنے ہاں چھپائے رکھتے ہیں۔ کیا معصیتِ رسولؐ کی اس سے زیادہ نمایاں مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ —— اس معصیتِ رسولؐ کی مثال جس کی سزا (قرآنِ کریم کی رو سے) جہنم ہے!

(۲) حضرت عثمانؓ کی درخواستِ عفو پر حضورؐ خاموش رہتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضورؐ اسے پسند نہیں فرماتے۔ لیکن حضرت عثمانؓ اس کے باوجود اپنی درخواست پر اصرار کئے جاتے ہیں! سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہا جائے؟

(۳) رسول اللہؐ دل سے چاہتے ہیں کہ اس شخص کو قتل کر دیا جائے، لیکن زبان سے ایسا نہیں کہتے۔ سوچئے کہ اس سے خود ذاتِ رسالتمآبؐ کا کس قسم کا کردار سامنے آتا ہے؟ (معاذاللہ ثم معاذاللہ)

(۴) حضورؐ صحابہ کرامؓ کو ڈانٹتے ہیں کہ جب میں نے اس قسم کا انداز اختیار کر رکھا تھا تو تم نے اس شخص کو قتل کیوں نہ کر دیا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اگر آپؐ زبان سے ایسا نہیں کہنا چاہتے تھے، تو کم از کم آنکھ ہی سے اس قسم کا اشارہ کر دیتے! اور آپؐ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ نبی اشارے نہیں کیا کرتا۔ یعنی حضورؐ یہ بات نہ زبان سے کہتے ہیں، نہ اشارہ کرتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ آپؐ کے صحابہؓ خود ہی حضورؐ کا عندیہ سمجھ جائیں اور اس شخص کو قتل کر دیں۔ (استغفراللہ) —— حالانکہ یہی صاحب (مودودی صاحب) دوسری جگہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ جب حضورؐ نے اپنے بعض صحابہؓ کو کعب بن اشرف کے قتل کرنے کی مہم پر روانہ فرمایا تو انہیں اجازت دی کہ اگر ضرورت پڑے تو تم جھوٹ سے بھی کام لے لینا۔ اور انہوں نے (توبہ۔ توبہ) نہایت فریب کارانہ انداز سے اُسے قتل کر دیا۔ (ترجمان القرآن۔ بابت، مئی ۱۹۵۸ء)

مودودی صاحب اور حضرت عثمانؓ

یہ تھا (مودودی صاحب کے نزدیک) حضرت عثمانؓ کا کردار، رسول اللہؐ کی زندگی میں۔ اس کے بعد جب حضرت عثمانؓ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو کیا ہوا، اسے خود سے سنیئے۔ لکھتے ہیں :۔

ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت

ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظام کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔

(تجدید و احیاءِ دین)

یہ تنقید یا تنقیص بلاواسطہ تو حضرت عثمانؓ کی ہے لیکن بالواسطہ اس کی زد میں تمام صحابہؓ آ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام کے استحکام کی ذمہ داری تنہا حضرت عثمانؓ (خلیفہ) کے سر پہ نہیں تھی — (قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق) مملکت کا جملہ نظم و نسق صحابہؓ کی مشاورت سے سرانجام پاتا تھا اس لئے اگر اس میں جاہلیت (یعنی زمانہ قبل از اسلام کے کافرانہ نظام) کے گھس آنے کے راستے کھل گئے تھے تو اس کی ذمہ داری تنہا خلیفہ پر نہیں بلکہ جملہ صحابہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت، حضورؐ کی وفات کے صرف بارہ تیرہ سال بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لئے اس وقت وہ "مہاجرین و انصار" موجود تھے جنہیں اللہ تعالےٰ نے السابقون الاوّلون سے تعبیر کیا، اور مومنِ حقہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہی حضرات (رضی اللہ عنہم) شجرِ طیبِ رسالتمآبؐ کے ثمراتِ اوّلین تھے —— اور ان کی (بقول مودودی صاحب) یہ حالت تھی! (پناہ بخدا)

مودودی صاحب کی یہ تنقید تو حضرت عثمانؓ کے نظامِ مملکت کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں تھی۔ اب ان کے ذاتی کردار کی طرف آیئے، لکھتے ہیں:۔

لیکن جب ان کے (شیخینؓ کے) بعد حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو وہ رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے گئے (جس پہ رسول اللہؐ اور اوّلین دو خلفاء کاربند چلے آ رہے تھے۔) انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایتیں کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص۱۰۶)

مودودی صاحب (اور ان کی جماعت) کی طرف سے موجودہ (بلکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک کے) برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جاتی ہے اس میں اقربا نوازی اور خویش پروری، سرِفہرست ہوتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ یہ صاحب کس دھڑلے سے حضرت عثمانؓ کو اسی جرم کا مرتکب قرار دیتے ہیں؟ اپنے جن اقربا کو حضرت عثمانؓ نے اس طرح نوازا تھا، ان کا ذاتی کیرکٹر کس قسم کا تھا، اس کے متعلق مودودی صاحب ولید بن عقبہ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

حضرت عثمانؓ نے انہیں کوفہ جیسے اہم صوبہ کا گورنر بنا دیا۔ وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا۔ "اور پڑھاؤں"؟ (ص۱۱۲)

یہ ہے حضرت عثمانؓ کا کردار جسے یہ صاحب اس جرأت و بے باکی سے پیش فرماتے ہیں اور اس سے قطعاً

ہونا چاہیئے تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشرؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظام کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔

(تجدید و احیاء دین)

یہ تنقید یا تنقیص بلاواسطہ تو حضرت عثمانؓ کی ہے لیکن بالواسطہ اس کی زد میں تمام صحابہؓ آ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام کے استحکام کی ذمہ داری تنہا حضرت عثمانؓ (خلیفہ) کے سر پر نہیں تھی ——— (قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق) مملکت کا جملہ نظم و نسق صحابہؓ کی مشاورت سے سرانجام پاتا تھا اس لئے اگر اس میں جاہلیت (یعنی زمانہ قبل از اسلام کے کافرانہ نظام) کے گھس آنے کے راستے کھل گئے تھے تو اس کی ذمہ داری تنہا خلیفہ پر نہیں بلکہ جملہ صحابہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت، حضورؐ کی وفات کے صرف بارہ تیرہ سال بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لئے اس وقت وہ "مہاجرین و انصار" موجود تھے جنہیں اللہ تعالےٰ نے السابقون الاوّلون سے تعبیر کیا، اور مومنِ حقّہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہی حضرات (رضی اللہ عنہم) شجرِ طیبِ رسالتمآبؐ کے ثمراتِ اوّلین تھے ——— اور ان کی (بقول مودودی صاحب) یہ حالت تھی! (پناہ بخدا)

مودودی صاحب کی یہ تنقید تو حضرت عثمانؓ کے نظامِ مملکت کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں تھی۔ اب ان کے ذاتی کردار کی طرف آئیے۔ لکھتے ہیں:۔

لیکن جب ان کے (شیخینؓ کے) بعد حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو وہ رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے گئے (جس پر رسول اللہؐ اور اوّلین دو خلفاء کاربند چلے آ رہے تھے۔) انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں جذبِ اعتراض بن کر رہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص۱۰۶)

مودودی صاحب (اور ان کی جماعت) کی طرف سے موجودہ (بلکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک کے) برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جاتی ہے اس میں اقربا نوازی اور خویش پروری، سرِفہرست ہوتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ یہ صاحب کس دھڑلے سے حضرت عثمانؓ کو اسی جرم کا مرتکب قرار دیتے ہیں؟ اپنے جن اقربا کو حضرت عثمانؓ نے اس طرح نوازا تھا، ان کا ذاتی کیرکٹر کس قسم کا تھا، اس کے متعلق مودودی صاحب ولید بن عقبہ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

حضرت عثمانؓ نے انہیں کوفہ جیسے اہم صوبہ کا گورنر بنا دیا۔ وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا۔ "اور پڑھاؤں"؟ (ص۱۱۴)

یہ ہے حضرت عثمانؓ کا کردار جسے یہ صاحب اس جرأت و بے باکی سے پیش فرماتے ہیں اور اس سے قطعاً

نہیں شرماتے! یہ (حضرت) عثمانؓ کون ہیں؟

(۱) انہیں سابقون الاوّلون میں سے ایک نہایت ممتاز اور جلیل القدر ہستی جن کے مومن حقہ ہونے کی شہادت، اور جن کے لئے جنت کی ضمانت خود خدا نے دی تھی۔

(۲) وہ جنہوں نے "اسلام" کے ایامِ عسرت کے زمانے میں، اس قدر مالی امداد دی تھی، جو آج تک ضرب المثل ہے۔

(۳) وہ (حضرت) عثمانؓ جن سے حضورؐ نبی اکرم نے اپنی (ایک بیٹی نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے) دو بیٹیوں کا نکاح کیا۔ ہم خود مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ جب آپ اپنی کسی صاحبزادی کے لئے رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے لڑکے کی سیرت و کردار کے متعلق کس قدر تجسس و تفحص سے کام لیتے، اور اس کی طرف سے اپنا اطمینان کر لیتے ہیں۔ سوچئے کہ جن بزرگوار کو حضورؐ نے اپنی دو صاحبزادیوں کے رشتے کے لئے منتخب فرمایا تھا، ان کا کردار اس قسم کا ہو گا جسے آپ پیش فرما رہے ہیں؟ اس سے خود حضورؐ کی ذات پر جس قسم کا طعن پڑتا ہے، اے کاش! آپ اسی کا خیال کر لیتے!

(۴) یہ وہ حضرت عثمانؓ ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر قریش کی طرف بھیجا۔ جب یہ خبر اڑی کہ قریش نے آپ کو شہید کر دیا ہے تو حضورؐ نے تمام صحابہؓ سے، سرفروشی کی بیعت لی، جسے بیعتِ رضوان کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کا ذکر قرآن کریم نے وجد و کیف کے ساتھ کیا ہے۔

(۵) یہ وہ (حضرت عثمانؓ) ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے منصبِ خلافت کے لئے منتخب فرمایا۔ اگر ان کا کردار ایسا ہی تھا تو ان لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کردار کے حامل کو ایسے منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا تھا؟

(۶) اور یہ وہ (حضرت عثمانؓ) ہیں جن کا شائع کردہ نسخہ قرآن، اُمت میں مستند تسلیم کیا جاتا چلا آ رہا ہے۔ آپ سوچئے کہ جب اس شخص کا کردار، جو ساری عمر حضورؐ نبی اکرم کے زیرِ تعلیم و تربیت رہا، اور جسے حضورؐ نے اپنی قرابت داری کے لئے منتخب کیا، اس قسم کا تھا، تو اس سے اس "درخت" کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے جس کا "پھل" اس قسم کا تھا؟

صحابہؓ مرتد ہو گئے تھے!

اس کے بعد، بہ ہیئتِ مجموعی صحابہؓ کے متعلق سنیئے۔

کسی نے مودودی صاحب سے ایک سوال پوچھا۔ اس نے پہلے یہ روایت لکھی کہ:

جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے بعض اصحاب کو بائیں طرف سے گرفتار کیا جائے گا تو میں کہوں گا (انہیں کچھ نہ کہو) یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ یہ تو میرے

نہیں شرماتے! یہ (حضرت) عثمانؓ کون ہیں؟

(۱) انہیں سابقون الاوّلون میں سے ایک نہایت ممتاز اور جلیل القدر ہستی جن کے مومنِ حقہ ہونے کی شہادت، اور جن کے لئے جنت کی ضمانت خود خدا نے دی تھی۔

(۲) وہ جنہوں نے "اسلام" کے ایامِ عسرت کے زمانے میں، اس قدر مالی امداد دی تھی، جو آج تک ضرب المثل ہے۔

(۳) وہ (حضرت) عثمانؓ جن سے حضورؐ نبی اکرم نے اپنی (ایک بیٹی نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے) دو بیٹیوں کا نکاح کیا۔ ہم خود مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ جب آپ اپنی کسی صاحبزادی کے لئے رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے لڑکے کی سیرت و کردار کے متعلق کس قدر تجسس و تفحص سے کام لیتے، اور اس کی طرف سے اپنا اطمینان کر لیتے ہیں۔ سوچئے کہ جن بزرگوار کو حضورؐ نے اپنی دو صاحبزادیوں کے رشتے کے لئے منتخب فرمایا تھا، ان کا کردار اس قسم کا ہو گا جسے آپ پیش فرما رہے ہیں؟ اس سے خود حضورؐ کی ذات پر جس قسم کا طعن پڑتا ہے، اے کاش! آپ اسی کا خیال کر لیتے!

(۴) یہ وہ حضرت عثمانؓ ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر قریش کی طرف بھیجا۔ جب یہ خبر اڑی کہ قریش نے آپ کو شہید کر دیا ہے تو حضورؐ نے تمام صحابہؓ سے، سرفروشی کی بیعت لی، جسے بیعتِ رضوان کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کا ذکر قرآن کریم نے وجد و کیف کے ساتھ کیا ہے۔

(۵) یہ وہ (حضرت عثمانؓ) ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے منصبِ خلافت کے لئے منتخب فرمایا۔ اگر ان کا کردار ایسا ہی تھا تو ان لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کردار کے حامل کو ایسے منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا تھا؟

(۶) اور یہ وہ (حضرت عثمانؓ) ہیں جن کا شائع کردہ نسخہ قرآن، اُمت میں مستند تسلیم کیا جاتا چلا آ رہا ہے۔ آپ سوچئے کہ جب اس شخص کا کردار، جو ساری عمر حضورؐ نبی اکرم کے زیرِ تعلیم و تربیت رہا، اور جسے حضورؐ نے اپنی قرابت داری کے لئے منتخب کیا، اس قسم کا تھا، تو اس سے اس "درخت" کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے جس کا "پھل" اس قسم کا تھا؟

صحابہؓ مرتد ہو گئے تھے!

اس کے بعد، بہ ہیئتِ مجموعی صحابہؓ کے متعلق سنیئے۔

کسی نے مودودی صاحب سے ایک سوال پوچھا۔ اس نے پہلے یہ روایت لکھی کہ:

جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے بعض اصحاب کو بائیں طرف سے گرفتار کیا جائے گا تو میں کہوں گا (انہیں کچھ نہ کہو) یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ یہ تو میرے

> اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا کہ تیری وفات کے بعد یہ لوگ الٹے پاؤں پھر گئے۔ اس پر میں حضرت عیسیٰ ؑ کی طرح کہوں گا کہ خداوندا! جب تک میں ان میں موجود رہا، ان کے اعمال کا نگران رہا، لیکن تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کا رقیب تھا۔

اس روایت کے درج کرنے کے بعد، مستفسر نے مودودی صاحب سے پوچھا کہ:

> اس روایت سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین اور تحقیر مترشح ہوتی ہے۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟

اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ تھا کہ یہ روایت (بلکہ اس قبیل کی دیگر روایات) جن میں صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو وضعی ہیں اور معاندینِ اسلام کی سازش کا نتیجہ جو اس قسم کے "پھل" پیش کرکے "درخت" کو معلول کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے جواب یہ لکھا:

> یہ معاملہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہؓ کے زمرے میں شمار ہوتے تھے مگر آپ کے بعد مرتد ہو گئے۔ اور ان لوگوں سے بھی متعلق جنہوں نے حضورؐ کے عہد میں اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر بعد میں بُری روش اختیار کر لی۔ (رسائل و مسائل، حصہ سوم۔ صفحہ ۲۱۲-۲۱۱)

اس جواب کی شقِ دوم کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں حضورؐ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ (یعنی وہ اعراب جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) لیکن شقِ اوّل کا تعلق تو حضورؐ کے تعلیم و تربیت یافتہ صحابہ کبارؓ سے ہے۔ مودودی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ صحابہ کبارؓ میں سے بھی بعض، حضورؐ کے بعد (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے! فرمائیے! اس سے حضورؐ کے متعلق کیا تصوّر ذہن میں آتا ہے؟

کہا جائے گا کہ یہ بات کتبِ احادیث میں لکھی ملتی ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک کسی روایت کا احادیث کے معتبر ترین مجموعوں (بخاریؒ اور مسلمؒ تک) میں درج ہونا اس کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں۔ حدیث وہی صحیح ہوگی جسے "مزاج شناسِ رسولؐ" صحیح قرار دیدے۔ اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔

صحابہؓ اور یزید

اور آگے بڑھئے۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ایشیا (لاہور) بابت ۱۲ رجولائی سنہ ۱۹۷۰ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق، مودودی صاحب نے لاہور کی ایک مجلسِ ذکرِ حسینؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر کی۔ اس میں یہ لفظ بھی زیرِ بحث آ گیا کہ یہ کیوں تھا کہ یزید کے زمانے میں جس قدر صحابہؓ موجود تھے (جن کی تعداد قریب پونے تین سو بتائی جاتی ہے۔) ان سب نے یزید کی بیعت کر لی تھی اور صرف امام حسینؓ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے فرمایا:

> اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا کہ تیری وفات کے بعد یہ لوگ الٹی چال چلے۔ اس پر میں حضرت عیسیٰؑ کی طرح کہوں گا کہ خداوندا! جب تک میں ان میں موجود رہا، ان کے اعمال کا نگران رہا، لیکن تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کا رقیب تھا۔

اس روایت کے درج کرنے کے بعد، مستفسر نے مودودی صاحب سے پوچھا کہ:

> اس روایت سے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین اور تحقیر مترشح ہوتی ہے۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟

اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ تھا کہ یہ روایت (بلکہ اس قبیل کی دیگر روایات) جن میں صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو وضعی ہیں اور معاندینِ اسلام کی سازش کا نتیجہ جو اس قسم کے "پھل" پیش کر کے "درخت" کو مطعون کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے جواب میں لکھا:-

> یہ معاملہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہؓ کے زمرے میں شمار ہوتے تھے مگر آپ کے بعد مرتد ہو گئے۔ اور ان لوگوں سے بھی متعلق جنہوں نے حضورؐ کے عہد میں اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر بعد میں بُری روش اختیار کر لی۔ (رسائل و مسائل، حصہ سوم۔ صفحہ ۲۱۱-۲۱۲)

اس جواب کی شقِ دوم کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں حضورؐ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ (یعنی وہ اعراب جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) لیکن شقِ اوّل کا تعلق تو حضورؐ کے تعلیم و تربیت یافتہ صحابہ کبارؓ سے ہے۔ مودودی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ صحابہ کبارؓ میں سے بھی بعض، حضورؐ کے بعد (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے! فرمایئے! اس سے حضورؐ کے متعلق کیا تصوّر ذہن میں آتا ہے؟

کہا جائے گا کہ یہ بات کتبِ احادیث میں لکھی ملتی ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک کسی روایت کا احادیث کے معتبر ترین مجموعوں (بخاری اور مسلم تک) میں درج ہونا اس کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں۔ حدیث وہی صحیح ہوگی جسے "مزاج شناسِ رسول" صحیح قرار دے دے۔ اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔

صحابہؓ اور یزید

اور آگے بڑھئے۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ایشیا (لاہور) بابت ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق، مودودی صاحب نے لاہور کی ایک مجلسِ ذکرِ حسینؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر کی۔ اس میں یہ لفظ بھی (بیزبکشا) آگیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یزید کے زمانے میں جس قدر صحابہؓ موجود تھے (جن کی تعداد قریب پونے تین سو بتائی جاتی ہے۔) ان سب نے یزید کی بیعت کر لی تھی اور صرف امام حسینؓ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے تو بیعت کر لی تھی۔ حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی اور وہ ان کو مطعون کرتے ہیں، حالانکہ جب کوئی مسلمان حکومت پوری طاقت سے قائم ہو تو اس کے خلاف اٹھنا ہما شما کا کام نہیں...... یہ حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ تو ہے جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی راہنمائی کرتا ہے...... یہ نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمان کا کام تماشائی بن کر بیٹھنا نہیں، بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے، خواہ اکیلا ہی ہو اور خواہ کچھ نتیجہ ہو۔

ہم نے اس اقتباس کو محض یہ بتانے کے لئے درج کرنے کی ہمت کی ہے کہ مودودی صاحب صحابہ کبارؓ کو "ہما شما" کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں (معاذ اللہ) "تماشائی" قرار دیتے ہیں جو ایسے اہم واقعہ پہ کسی "مسلمان کا کام" نہیں ہو سکتا۔ اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ وہ ان صحابہؓ کو کس مقام پہ پہنچا رہے ہیں!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی ایشیا کی ۷ راگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں، حبیب المسلم نامی ایک صاحب کا ایک مراسلہ (یا مکتوب) شائع ہوا، جس میں انہوں نے لکھا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یزید کی خلافت اسلام کے خلاف تھی اور اس کے باوجود صحابہؓ نے اس کی بیعت کر لی؛

> کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ، خاک بدہن، گستاخ، بزدل، یا لالچی تھے کہ انہوں نے حق کا ساتھ نہ دیا اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

اس کے بعد، انہوں نے لکھا کہ:۔

> یار لوگوں نے تو چور دروازہ تلاش کیا ہوا ہے۔ یزید کو بُرا کہو۔ پھر یزید کو خلیفہ بنانے والوں اور بنوانے والوں کو بُرا کہو۔ پھر جب معاویہؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو بُرا کہا جائے گا تو بات ضرور ان تک پہنچے گی جنہوں نے ان لوگوں پہ اعتماد کیا اور آگے بڑھایا۔

ایشیا نے اسے بھی شائع کر دیا اور مودودی صاحب کو بدستور "اللہ کا شاہکار" بھی قرار دیا چلا جائیگا!

مدینہ کے صحابہؓ

ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ لیکن جو کچھ اب سامنے آ رہا ہے، اسے سینہ پہ پتھر رکھ کر پڑھیئے۔ مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" میں لکھا ہے کہ جب یزید کی فوج نے مدینہ فتح کیا تو:۔

> یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لئے فوج کو اجازت دے دی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے۔ ان تین دنوں کے اندر...... وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے تو بیعت کر لی تھی۔ حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی اور وہ ان کو مطعون کرتے ہیں، حالانکہ جب کوئی مسلمان حکومت پوری طاقت سے قائم ہو تو اس کے خلاف اٹھنا ہما شما کا کام نہیں..... یہ حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ تو ہے جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی راہنمائی کرتا ہے..... یہ نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمان کا کام تماش بین بن کر بیٹھنا نہیں، بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے، خواہ اکیلا ہی ہو اور خواہ کچھ نتیجہ ہو۔

ہم نے اس اقتباس کو محض یہ بتانے کے لئے درج کرنے کی ہمت کی ہے کہ مودودی صاحب، صحابہ کبارؓ کو "ہما شما" کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں (معاذ اللہ) "تماش بین" قرار دیتے ہیں جو ایسے اہم واقعہ پر کسی "مسلمان کا کام" نہیں ہو سکتا۔ اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ وہ ان صحابہؓ کو کس مقام پہ پہنچا رہے ہیں!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی ایشیا کی ۷ اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں، حبیب المسلم نامی ایک صاحب کا ایک مراسلہ (یا مکتوب) شائع ہوا، جس میں انہوں نے لکھا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یزید کی خلافت اسلام کے خلاف تھی اور اس کے باوجود صحابہؓ نے اس کی بیعت کر لی،

کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ، خاک بدہن، گستاخ، بزدل، یا لالچی تھے کہ انہوں نے حق کا ساتھ نہ دیا اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

اس کے بعد، انہوں نے لکھا کہ:

یار لوگوں نے تو چور دروازہ تلاش کیا ہوا ہے۔ یزید کو برا کہو۔ پھر یزید کو خلیفہ بنانے والوں اور بنوانے والوں کو برا کہو۔ پھر جب معاویہؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو برا کہا جائے گا تو بات ضرور ان تک پہنچے گی جنہوں نے ان لوگوں پر اعتماد کیا اور آگے بڑھایا۔

ایشیا نے اسے بھی شائع کر دیا اور مودودی صاحب کو بدستور "اللہ کا شاہکار" بھی قرار دیتا چلا جائیگا!

مدینہ کے صحابہؓ

ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ لیکن جو کچھ اب سامنے آ رہا ہے، اسے سینہ پہ پتھر رکھ کر پڑھیئے۔

مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" میں لکھا ہے کہ جب یزید کی فوج نے مدینہ فتح کیا تو:

یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لئے فوج کو اجازت دے دی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے۔ ان تین دنوں کے اندر..... وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس

گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی اور (حافظ ابن کثیر کے قول کے مطابق کہا جاتا ہے کہ) ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (ص۱۸۲)

یزید کی فوج کے "وحشیوں" کو چھوڑیئے۔ مدینہ طیبہ کی آبادی کو لیجئے۔ یہ (مبینہ) واقعہ رسول اللہؐ کی وفات سے صرف پچاس سال بعد کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت، یہ آبادی صحابہ کبارؓ اور تابعینؒ پر مشتمل تھی ـــــ اور ان میں عورتیں بھی شامل تھیں اور مرد بھی۔ یہ خواتین تین دن تک زنا سے حاملہ ہوتی رہیں اور ان کے مرد (صحابہؓ اور تابعینؒ) خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ (استغفر اللہ، ہزار بار استغفر اللہ)

یہ ہے جو کچھ اس شخص (خلافت و ملوکیت کے مؤلف) نے صحابہ کبارؓ کے متعلق لکھا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اسلام، اور حضور رسالتمآبؐ کا کوئی بدترین، غیر مسلم، مخالف، اس سے زیادہ کچھ اور لکھ سکتا تھا! اور اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ جس درخت کے پھل (بقول مودودی صاحب) ایسے ہوں، اس کے متعلق دنیا کیا تصور ذہن میں قائم کرے گی۔

اب آیئے اس واقعہ کی طرف جس تک پہنچنے کے لئے ہم نے یہ قدرے طویل (اور نہایت جگر پاش) سفر طے کیا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے، قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے کراچی سے ہمیں لکھا کہ جماعتِ اسلامی کے اشاعتی ادارہ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے:-

مکتوباتِ حضرت علیؓ

انہوں نے اس میں سے کچھ اقتباسات نقل کر کے بھیجے ـــــ ہر چند ہمارے یہ مکتوب نگار قابلِ اعتماد تھے لیکن وہ اقتباسات ایسے تحیر انگیز تھے کہ ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم اس کتاب کو خود دیکھ لیں۔ چنانچہ اس کا ستمبر ۱۹۷۱ء کا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کے مرتب ہیں، حکیم نبی احمد خاں، رام پوری۔ اس میں انہوں نے (بقول ان کے) حضرت علیؓ کے ایسے خطوط جمع کئے ہیں جو آپ (حضرت علیؓ) نے اپنے ہم عصر، صحابہؓ کے نام لکھے تھے۔ یہ مکتوبات اصل عربی اور ان کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ تاریخ[1] بتاتی ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں، امت دو گروہوں میں بٹ گئی تھی جو ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ایک گروہ کے سربراہ حضرت علیؓ تھے اور دوسرے کے حضرت معاویہؓ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ حضرت علیؓ نے یہ خطوط ان صحابہؓ کو لکھے تھے جو ان کے مخالف گروہ میں شامل تھے۔ ان میں جو انداز اختیار کیا گیا اور جو زبان استعمال کی گئی ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچیں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے ہمارے

---

[1] اس تاریخ سے متعلق ہمارے خیالات قارئین کو معلوم ہیں۔ ہم اسے قطعاً قابلِ اعتماد تصور نہیں کرتے۔ (طلوعِ اسلام)

گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی اور (حافظ ابن کثیر کے قول کے مطابق کہا جاتا ہے کہ) ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (ص۱۸۲)

یزید کی فوج کے "وحشیوں" کو چھوڑیئے۔ مدینہ طیبہ کی آبادی کو لیجئے۔ یہ (مبینہ) واقعہ رسول اللہؐ کی وفات سے صرف پچاس سال بعد کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت، یہ آبادی صحابہ کبارؓ اور تابعینؒ پر مشتمل تھی ـــــ اور ان میں عورتیں بھی شامل تھیں اور مرد بھی۔ یہ خواتین تین دن تک زنا سے حاملہ ہوتی رہیں اور ان کے مرد (صحابہؓ اور تابعینؒ) خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ (استغفر اللہ، ہزار بار استغفر اللہ)

یہ ہے جو کچھ اس شخص (خلافت و ملوکیت کے مؤلف) نے صحابہ کبارؓ کے متعلق لکھا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اسلام، اور حضور رسالتمآبؐ کا کوئی بدترین، غیر مسلم، مخالف، اس سے زیادہ کچھ اور لکھ سکتا تھا! اور اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ جس درخت کے پھل (بقول مودودی صاحب) ایسے ہوں، اس کے متعلق دنیا کیا تصور ذہن میں قائم کرے گی۔

اب آیئے اس واقعہ کی طرف جس تک پہنچنے کے لئے ہم نے یہ قدرے طویل (اور نہایت جگر پاش) سفر طے کیا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے، قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے کراچی سے ہمیں لکھا کہ جماعتِ اسلامی کے اشاعتی ادارہ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے:

مکتوباتِ حضرتِ علیؓ

انہوں نے اس میں سے کچھ اقتباسات نقل کر کے بھیجے ـــــ ہر چند ہمارے یہ مکتوب نگار قابلِ اعتماد تھے لیکن وہ اقتباسات ایسے تحیر انگیز تھے کہ ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم اس کتاب کو خود دیکھ لیں۔ چنانچہ اس کا ستمبر ۱۹۷۱ء کا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کے مرتب ہیں، حکیم نبی احمد خاں، رام پوری۔ اس میں انہوں نے (بقول ان کے) حضرت علیؓ کے ایسے خطوط جمع کئے ہیں جو آپ (حضرت علیؓ) نے اپنے ہم عصر، صحابہؓ کے نام لکھے تھے۔ یہ مکتوبات اصل عربی اور ان کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ تاریخ[1] بتاتی ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں، امت دو گروہوں میں بٹ گئی تھی جو ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ایک گروہ کے سربراہ حضرت علیؓ تھے اور دوسرے کے حضرت معاویہؓ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ حضرت علیؓ نے یہ خطوط ان صحابہؓ کو لکھے تھے جو ان کے مخالف گروہ میں شامل تھے۔ ان میں جو انداز اختیار کیا گیا اور جو زبان استعمال کی گئی ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچیں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے ہمارے

---

[1] اس تاریخ سے متعلق ہمارے خیالات قارئین کو معلوم ہیں۔ ہم اسے قطعاً قابلِ اعتماد تصور نہیں کرتے۔ (طلوعِ اسلام)

زمانے کی دو، سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف مصروفِ طعن آمیزی اور مشغولِ دشنام طرازی ہیں! جو شخص بھی (خالی الذہن ہو کر) ان خطوط کو پڑھے گا، اس کے دل میں فطری طور پر یہ خیال اُبھرے گا کہ کیا یہی تھی وہ تعلیم جو رسولؐ اللہ نے انہیں دی تھی اور اس قسم کے تھے وہ انسان جن کی تعمیر، تربیتِ نبوی نے کی تھی؟ اس سوال کے بعد، آپ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ مکتوب نگار حضرت علیؓ کو بتایا جاتا ہے جن کی، بچپن سے لے کر آخر تک، تعلیم و تربیت، آغوشِ رسالتؐ اور خانۂ نبویؐ میں ہوئی اور جنہیں حضورؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے ازدواجی رشتہ کے لئے منتخب فرمایا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ حضرت علیؓ (اپنے ان مبینہ خطوط میں) اپنے مخالف، حضرت معاویہؓ کو کن الفاظ سے یاد فرماتے ہیں ـــــ حضرت معاویہؓ کے علوِ مرتبت کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فتح مکہ سے پہلے کے مسلمان، اس لئے خدا کی ان نوازشات کے مستحق، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ پھر، حضورؐ کے کاتبِ وحی، جو اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضورؐ کو ان پر کس قدر اعتماد تھا۔ آپ اپنے دورِ خلافت میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو گراں قدر عطیات دیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق ان مکتوبات میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں:۔

(۱) ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ خط و کتابت میں جب مسلمانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے تو "السلام علیکم" لکھا جاتا ہے اور جب مخاطب غیر مسلم ہوں تو "سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" لکھتے ہیں۔ حضرت علیؓ اپنے مکتوب (ص۷) کا آغاز "سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے فریقِ مقابل (حضرت معاویہؓ) کو مسلمانوں کے زمرہ میں بھی شمار نہیں کرتے ـــــ خط میں لکھتے ہیں:۔

> اگر تم نے (میری ہدایت پر) عمل نہ کیا تو میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا، تم بالکل بے سرے بن گئے ہو، تم پر شیطان نے قبضہ کر لیا ہے اور وہی تمہاری رگوں میں خون کے بجائے دوڑ رہا ہے۔ (ص۷)

(۲) حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت علیؓ خود ان کے متعلق کیا الفاظ استعمال کرتے ہیں، اسے تو متعلقہ عنوان میں بتایا جائے گا۔ حضرت معاویہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> تم نے اپنی مروت ایسے فاسق کے لئے ترک کر دی جس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ ..... اس نے تم سے تمہارا دین اور امانت، دنیا اور آخرت، سب کچھ چھین لیا..... پس تم اس مچھڑیئے کی طرح ہو جو رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی میں شیر کے

ط ضمناً۔ حضرت معاویہؓ، رسولؐ اللہ کے برادرِ نسبتی بھی تھے۔ (طلوعِ اسلام)

زمانے کی دو، سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف مصروفِ طعن آمیزی اور مشغولِ دشنام طرازی ہیں! جو شخص بھی (خالی الذہن ہو کر) ان خطوط کو پڑھے گا، اس کے دل میں فطری طور پر یہ خیال اُبھرے گا کہ کیا یہی تھی وہ تعلیم جو رسولؐ اللہ نے انہیں دی تھی اور اس قسم کے تھے وہ انسان جن کی تعمیر، تربیتِ نبوی نے کی تھی؟ اس سوال کے بعد، آپ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ مکتوب نگار حضرت علیؓ کو بتایا جاتا ہے جن کی، بچپن سے لے کر آخر تک، تعلیم و تربیت، آغوشِ رسالتؐ اور خانۂ نبویؐ میں ہوئی اور جنہیں حضورؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے ازدواجی رشتہ کے لئے منتخب فرمایا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ حضرت علیؓ (اپنے ان مبینہ خطوط میں) اپنے مخالف، حضرت معاویہؓ کو کن الفاظ سے یاد فرماتے ہیں ـــــ حضرت معاویہؓ کے علوِ مرتبت کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فتح مکہ سے پہلے کے مسلمان، اس لئے خدا کی ان نوازشات کے مستحق، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ پھر حضورؐ کے کاتبِ وحی، جو اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضورؐ کو ان پر کس قدر اعتماد تھا۔ آپ اپنے دورِ خلافت میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو گراں قدر عطیات دیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق ان مکتوبات میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں:۔

(۱) ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ خط و کتابت میں جب مسلمانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے تو "السلام علیکم" لکھا جاتا ہے اور جب مخاطب غیر مسلم ہوں تو "سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" لکھتے ہیں۔ حضرت علیؓ اپنے مکتوب (ص۷) کا آغاز "سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے فریقِ مقابل (حضرت معاویہؓ) کو مسلمانوں کے زمرہ میں بھی شمار نہیں کرتے ـــــ خط میں لکھتے ہیں:۔

> اگر تم نے (میری ہدایت پر) عمل نہ کیا تو میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا، تم بالکل بے سرے بن گئے ہو، تم پر شیطان نے قبضہ کر لیا ہے اور وہی تمہاری رگوں میں خون کے بجائے دوڑ رہا ہے۔ (ص۱۷)

(۲) حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت علیؓ خود ان کے متعلق کیا الفاظ استعمال کرتے ہیں، اسے تو متعلقہ عنوان میں بتایا جائے گا۔ حضرت معاویہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> تم نے اپنی مروت ایسے فاسق کے لئے ترک کر دی جس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔
> ..... اس نے تم سے تمہارا دین اور امانت، دنیا اور آخرت، سب کچھ چھین لیا.....
> پس تم اس بھیڑیئے کی طرح ہو جو رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی میں شیر کے

ف ضمناً۔ حضرت معاویہؓ، رسولؐ اللہ کے برادرِ نسبتی بھی تھے۔ (طلوعِ اسلام)

پیچھے لگا۔ اس کے جھوٹے ، بچے کھچے اور اس کے شکار کے اوجھ کی تلاش میں رہتا ہے ...... اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے تم پر ، اور جگر خوار ماں (ہندہ) کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) پر قابو دے دیا تو میں تم دونوں کو قریش کے ان ظالموں سے ملا دوں گا ، جن کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے زمانے میں ہلاک فرمایا۔ اور اگر تم میرے پیچھے بھی نہ آئے اور میرے بعد باقی رہے تو تمہیں اللہ تعالیٰ سمجھ لے گا۔ اور اس کا انتقام و عذاب کافی ہے۔ (صـ۱۲۳ ، صـ۱۱۱)

(۳) ـــــ اے معاویہؓ ! تم اپنے نفس کے متعلق خدا سے ڈرو اور شیطان کی قیادت میں سے اپنے آپ کو نکال لو۔ (صـ۱۷۹)

(۴) ـــــ دیکھو ! بغاوت اور جھوٹ انسان کو دین اور دنیا دونوں میں ذلیل ، اور عیب گیر کے سامنے اس کی خرابیاں ظاہر کر دیتے ہیں ...... تم مجھے قرآن کی طرف بلا رہے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ نہ تم اہلِ قرآن ہو ، نہ اس کا فیصلہ تمہارا مقصود ہے۔ (صـ۱۸۷-۸۹)

(۵) محمد ابن ابوبکرؓ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں :-

میں نے فاجر ابن فاجر معاویہ ، اور فاجر ابن فاجر عمروؓ کے خطوط پڑھ لئے ـــ دونوں عملِ معصیت میں باہم متحد ...... رشوت دینے والے اور دنیا (مجلس) میں ناپسندیدہ ہیں۔ (صـ۲۱۵)

(۶) اپنے ساتھیوں (اہلِ شیعتہ) کے نام ایک طویل مراسلہ میں رقمطراز ہیں :-

تم لوگ اپنی نااتفاقی اور بے عملی کے باوجود ان لوگوں سے کہیں بہتر اور ہدایت یافتہ ہو۔ تم میں حکماء ، علماء ، فقہاء ، حفاظ ، تہجد گزار ، عابد ، زاہد ، نمازی اور قرآن خواں ہیں۔ کیا تمہیں یہ امر ناگوار نہیں گزرتا کہ تم میں سے یہ احمق ، رذیل اور شریر تم سے حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ (صـ۲۴۵)

اللہ کے بندو ! دیکھو ، شیطان کے ساتھیوں ، لالچیوں اور جفا شعاروں کی اپنی ہلاکت ، گمراہی اور باطل پرستی میں کوشش ، پاکباز ، حق پرست ، اطاعت شعار لوگوں کی اطاعتِ الٰہی اور خیرخواہی امام کی جدوجہد سے اولیٰ نہیں ہو سکتی ...... میرے دل کو کڑھن اور دکھ تو اس بات پر ہے کہ اس امت ، پر احمق اور بداعمال حاکم ہوں اور اللہ کا مال دست بدست لیں۔ اللہ کے بندوں کو غلام بنائیں۔ نیکوکاروں سے لڑیں اور بدکاروں سے گٹھ جوڑ کریں۔ (صـ۲۴۳)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام

آپ بلند پایہ ، جلیل القدر ، صحابی - آپ السابقون الاولون میں سے ہیں۔ مکہ میں اسلام لائے اور پہلی ہجرت حبشہ کو کی

پیچھے لگا۔ اس کے جھوٹے، بچے کھچے اور اس کے شکار کے اوجھ کی تلاش میں رہتا ہے...... اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے تم پر، اور جگر خوار ماں (ہندہ) کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) پر قابو دے دیا تو میں تم دونوں کو قریش کے ان ظالموں سے ملا دوں گا، جن کو اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہلاک فرمایا۔ اور اگر تم میرے قبضے میں نہ آئے اور میرے بعد باقی رہے تو تمہیں اللہ تعالیٰ سمجھ لے گا۔ اور اس کا انتقام و عذاب کافی ہے۔ (ص۱۰۳، ص۱۱۱)

(۳) —— اے معاویہؓ! تم اپنے نفس کے متعلق خدا سے ڈرو اور شیطان کی قیادت میں سے اپنے آپ کو نکال لو۔ (ص۱۷۹)

(۴) —— دیکھو! بغاوت اور جھوٹ انسان کو دین اور دنیا دونوں میں ذلیل، اور عیب گیر کے سامنے اس کی خرابیاں ظاہر کر دیتے ہیں...... تم مجھے قرآن کی طرف بلا رہے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ نہ تم اہلِ قرآن ہو، نہ اس کا فیصلہ تمہارا مقصود ہے۔ (ص۱۸۹-۱۸۷)

(۵) محمد بن ابوبکرؓ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:-

میں نے فاجر ابن فاجر معاویہ، اور فاجر ابن فاجر عمروؓ کے خطوط پڑھ لئے — دونوں عملِ معصیت میں باہم متحد...... رشوت دینے والے اور دنیا (طلب) میں ناپسندیدہ ہیں۔ (ص۲۱۵)

(۶) اپنے ساتھیوں (اِلٰی شِیْعَتِہٖ) کے نام ایک طویل مراسلہ میں رقمطراز ہیں:-

تم لوگ اپنی نااتفاقی اور بے عملی کے باوجود ان لوگوں سے کہیں بہتر اور ہدایت یافتہ ہو۔ تم میں حکماء، علماء، فقہاء، حفاظ، تہجد گزار، عابد، زاہد، نمازی اور قرآن خواں ہیں۔ کیا تمہیں یہ امر ناگوار نہیں گزرتا کہ تم میں کے یہ احمق، رذیل اور شریر تم سے حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ (ص۲۴۵)

اللہ کے بندو! دیکھو، شیطان کے ساتھیوں، لالچیوں اور جفا شعاروں کی اپنی ہلاکت، گمراہی اور باطل پرستی میں کوشش، پاکباز، حق پرست، اطاعت شعار لوگوں کی اطاعتِ الٰہی اور خیرخواہیِ امام کی جدوجہد سے اولیٰ نہیں ہو سکتی......

میرے دل کو کڑھن اور دکھ تو اس بات پر ہے کہ اس امت پر احمق اور بداعمال حاکم ہوں اور اللہ کا مال دست بدست لیں۔ اللہ کے بندوں کو غلام بنائیں۔ نیکوکاروں سے لڑیں اور بدکاروں سے گٹھ جوڑ کریں۔ (ص۲۴۶)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام

آپ بلند پایہ، جلیل القدر، صحابی۔ آپ السابقون الاولون میں سے ہیں۔ مکہ میں اسلام لائے اور پہلی ہجرت حبشہ کی ...

فرمائی، پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضورؐ نے انہیں یمن کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ جنگ صفین میں جب پنچوں کا مسئلہ در پیش ہوا تو حضرت علیؓ نے انہیں اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ نے انہیں گورنری سے بدیں الفاظ علیحدگی کا حکم۔ اور فرمایا کہ "تم بذلت و خواری ہماری حکومت سے علیحدہ ہو جاؤ" (ص۱۱۱) اور اپنے خط میں لکھا کہ:۔

> تم وہ شخص ہو جسے خواہش نفس نے گمراہ کر دیا ہے اور جس پر دھوکا قابو پا چکا ہے۔ (ص۱۹۹)

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے متعلق

اسی کتاب میں حضرت طلحہؓ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:۔

> سابقین اوّلین اور عشرۂ مبشرہ میں تھے۔ جنگِ اُحد میں حضورؐ جب کفار کے نرغے میں آ گئے تو حضرت طلحہؓ نے ہی حضورؐ کی حفاظت فرمائی۔ آپ آنحضرتؐ کی سپر بن گئے۔ تیروں اور نیزوں کو اپنے اوپر روکتے رہے تا آنکہ آپ اس قدر زخمی ہوئے کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جنگ ختم ہونے پر حضورؐ آپ کو اپنی پشت مبارک پر اٹھا کر لائے اور جنتی ہونے کی بشارت دی۔ خود حضرت علیؓ نے انہیں "شیخ المہاجرین" کہا ہے۔ (ص۳۳۳)

اور حضرت زبیرؓ کا تعارف (اسی کتاب میں) ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:۔

> حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ باہم، پھوپھی زاد بھائی تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماءؓ، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ بھی عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "ہر نبی کے حواری (مددگار) ہوتے ہیں۔ میرے حواری طلحہؓ اور زبیرؓ ہیں۔" (ص۳۲۸)

ان حضرات (طلحہؓ اور زبیرؓ) کے متعلق حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> (معاویہ دیکھو!) طلحہؓ اور زبیرؓ نے پہلے تو مدینہ میں میرے ہاتھ پر بیعت کی — پھر توڑ دی[۱]۔ ان کا یہ فعل ایک طرح کا ارتداد تھا۔ اس پر ہر طرح کی کوشش کے بعد مجھے ان سے لڑنا پڑا۔ جس میں حق بات ہو کے رہی اور اللہ کا وہ حکم نافذ ہو کے رہا جسے وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے۔ (ص۱۳۹)

---

[۱] یعنی قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص کے مطالبہ کے سلسلہ میں انہوں نے حضرت عائشہؓ کا ساتھ دیا تھا۔ (طلوع اسلام)

فرمائی، پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضورؐ نے انہیں یمن کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ جنگ صفین میں جب پنچوں کا مسئلہ در پیش ہوا تو حضرت علیؓ نے انہیں اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ نے انہیں گورنری سے بدیں الفاظ علیحدگی کا حکم۔ اور فرمایا کہ "تم بذلت و خواری ہماری حکومت سے علیحدہ ہو جاؤ" (ص۱۱۰)

اور اپنے خط میں لکھا کہ:

> تم وہ شخص ہو جسے خواہش نفس نے گمراہ کر دیا ہے اور جس پر دھوکا قابو پا چکا ہے۔ (ص۱۶۹)

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے متعلق

اسی کتاب میں حضرت طلحہؓ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

> سابقین اوّلین اور عشرۂ مبشرہ میں تھے۔ جنگِ اُحد میں حضورؐ جب کفار کے نرغے میں آ گئے تو حضرت طلحہؓ نے ہی حضورؐ کی حفاظت فرمائی۔ آپ آنحضرتؐ کی سپر بن گئے۔ تیروں اور نیزوں کو اپنے اوپر روکتے رہے تا آنکہ آپ اس قدر زخمی ہوئے کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جنگ ختم ہونے پر حضورؐ آپ کو اپنی پشت مبارک پر اٹھا کر لائے اور جنتی ہونے کی بشارت دی۔ خود حضرت علیؓ نے انہیں "شیخ المہاجرین" کہا ہے۔ (ص۳۳۳)

اور حضرت زبیرؓ کا تعارف (اسی کتاب میں) ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

> حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ ماموں، پھوپھی زاد بھائی تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماءؓ، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ بھی عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "ہر نبی کے حواری (مددگار) ہوتے ہیں۔ میرے حواری طلحہؓ اور زبیرؓ ہیں"۔ (ص۳۲۸)

ان حضرات (طلحہؓ اور زبیرؓ) کے متعلق حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> (معاویہ دیکھو!) طلحہؓ اور زبیرؓ نے پہلے تو مدینہ میں میرے ہاتھ پر بیعت کی — پھر توڑ دی۔[1] ان کا یہ فعل ایک طرح کا ارتداد تھا۔ اس پہ ہر طرح کی کوشش کے بعد مجھے ان سے لڑنا پڑا۔ جس میں حق بات ہو کے رہی اور اللہ کا وہ حکم نافذ ہو کے رہا جسے وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے۔ (ص۱۳۹)

---

[1] یعنی قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص کے مطالبہ کے سلسلہ میں انہوں نے حضرت عائشہؓ کا ساتھ دیا تھا۔ (طلوع اسلام)

فاتح مصر، حضرت عمرو بن العاص رض کے متعلق

مکتوب ۴۸ میں لکھا ہے :۔

بندۂ خدا، علی رض، امیرالمؤمنین کی طرف سے، نسل بریدہ، ابن نسل بریدہ، عمرو ابن العاص، ابن وائل کے نام جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں محمد اور آپ کے خاندان کا دشمن رہا...... تم نے اپنی مروت ایسے فاسق کے لئے ترک کر دی، جس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ جو اپنی مجلس میں عزت دار پر عیب لگاتا ہے اور اپنی محبت میں بردبار کو بے وقوف کہتا ہے ...... اس نے تمہارا دین و امانت، دنیا و آخرت سب کچھ چھین لیا ہے۔ بس تم اس بھیڑیئے کی طرح ہو جو رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی میں شیر کے پیچھے لگا، اس کے جھوٹے، بچے کھچے، اور اس کے شکار کے اوجھ کی تلاش میں رہتا ہے۔ (صفحہ ۱۰۱)

حضرت علی رض نے محمد بن ابی بکر رض کے نام اپنے خط میں لکھا :۔

میں نے فاجر ابن فاجر (معاویہ) اور فاجر ابن کافر عمرو کے خطوط پڑھ لئے۔ دونوں عمل معصیت میں باہم متحد، حکومت میں ایک دوسرے کے موافق۔ رشوت دینے والے اور دنیا بھر میں ناپسندیدہ ہیں۔ (صفحہ ۲۱۵)

آپ نے اپنے ساتھیوں کے نام مراسلہ میں لکھا :

(یہ لوگ) دین سے منحرف، رشوت خور اور دنیا کے بندے ہیں۔ مجھے خبر لگی ہے کہ بدنام ماں کے بیٹے (عمرو ابن العاص رض) نے معاویہ رض کی بیعت اس وقت تک نہیں کی، جب تک اس نے اتنی بڑی رشوت لینے کی شرط نہ کر لی جو اس کی پوری سلطنت (مصر) سے زیادہ ہے۔ اس، دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والے کے ہاتھ خالی رہ جائیں، اور لوگوں کی دولت سے ایک دغابازانہ فاسق کی حمایت خریدنے والے کے ہاتھ خاک میں مل جائیں...... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر تم پر حاکم بن گئے تو تم پر غصہ نکالیں گے، فخر کریں گے، جابرانہ حکومت کریں گے۔ غضب کرنے میں دست درازی دکھائیں گے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلائیں گے۔ نیز خواہشات نفسانی کے پیچھے چلیں گے اور کبھی صحیح فیصلے نہیں کریں گے۔ (صفحہ ۲۷۵-۲۷۳)

حضرت عبداللہ ابن عباس رض کے متعلق

اس کتاب میں آپ کا تعارف ان الفاظ سے کرایا گیا ہے :۔

جلیل القدر صحابی رض اور رسول اللہ کے چچازاد بھائی تھے۔ مکے میں پیدا ہوئے اور آخر

فاتح مصر، حضرت عمرو بن العاصؓ کے متعلق

مکتوب ۳۹ میں لکھا ہے :۔

بندۂ خدا، علیؓ، امیرالمؤمنین کی طرف سے، نسل بریدہ، ابن نسل بریدہ، عمرو ابن العاص، ابن وائل کے نام جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں محمدؐ اور آپ کے خاندان کا دشمن رہا...... تم نے اپنی مروت ایسے فاسق کے لئے ترک کر دی، جس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ جو اپنی مجلس میں عزت دار پر عیب لگاتا ہے اور اپنی صحبت میں بردبار کو بے وقوف کہتا ہے...... اس نے تمہارا دین و امانت، دنیا و آخرت سب کچھ چھین لیا ہے۔ پس تم اس بھیڑیئے کی طرح ہو جو رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی میں شیر کے پیچھے لگا، اس کے جھوٹے، بچے کچھے، اور اس کے شکار کے اوجھ کی تلاش میں رہتا ہے۔ (ص۱۰۱)

حضرت علی رضؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کے نام اپنے خط میں لکھا :۔

میں نے فاجر ابن فاجر (معاویہؓ) اور فاجر ابن کافر عمرو کے خطوط پڑھ لئے۔ دونوں عمل معصیت میں باہم متحد، حکومت میں ایک دوسرے کے موافق۔ رشوت دینے والے اور دنیا بھر میں ناپسندیدہ ہیں۔ (ص۲۱۵)

آپ نے اپنے ساتھیوں کے نام مراسلہ میں لکھا :

(یہ لوگ) دین سے منحرف، رشوت خور اور دنیا کے بندے ہیں۔ مجھے خبر لگی ہے کہ بدنام ماں کے بیٹے (عمرو ابن العاصؓ) نے معاویہؓ کی بیعت اس وقت تک نہیں کی، جب تک اس نے اتنی بڑی رشوت لینے کی شرط نہ کر لی جو اس کی پوری سلطنت (مصر) سے زیادہ ہے۔ اس، دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والے کے ہاتھ خالی رہ جائیں، اور لوگوں کی دولت سے ایک دغاباز فاسق کی حمایت خریدنے والے کے ہاتھ خاک میں مل جائیں...... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر تم پر حاکم بن گئے تو تم پر غصہ نکالیں گے، فخر کریں گے، جابرانہ حکومت کریں گے۔ غضب کرنے میں دست درازی دکھائیں گے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلائیں گے۔ نیز خواہشات نفسانی کے پیچھے چلیں گے اور کبھی صحیح فیصلے نہیں کریں گے۔ (ص۲۷۳-۲۷۵)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے متعلق

اس کتاب میں آپ کا تعارف ان الفاظ سے کرایا گیا ہے :۔

جلیل القدر صحابیؓ اور رسولؐ اللہ کے چچازاد بھائی تھے۔ مکے میں پیدا ہوئے اور آخر

تک صحبتِ نبویؐ سے مشرف رہے۔ مفسرِ قرآن اور راویٔ حدیث تھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں شریک رہے۔

حضرت علیؓ نے آپ کے نام اپنے خط میں لکھا:-

مَیں نے تمہیں اس لئے امانت (حکومت) میں شریک کیا تھا اور اپنا ہمدم و ہمراز بنایا تھا کہ میری نظر میں، میرے خاندان میں، تم سے زیادہ باوثوق کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ لیکن تم نے جب دیکھا کہ تمہارے ابن عم پر زمانہ سختیاں کر رہا ہے، اور دشمن برسرِ پیکار ہے، تو تم نے بھی اس کی حمایت سے منہ موڑ لیا اور دوسرے چھوڑنے والوں کی طرح تم نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ اور دیگر لوگوں کی طرح اس کی مدد نہ کی۔ اُمت کے جس مال پر تمہارا بس چلا، اسے تم نے اچک لیا، جیسے تیز رفتار بھیڑیا زخمی بکری کو اُڑا لے جاتا ہے۔ دیکھو ذرا ٹھہرو (اور سوچو) گویا تم اپنی عمر پوری کر چکے ہو، اور تمہارے اعمال تمہارے سامنے ایسی جگہ پیش کئے جا رہے ہیں جہاں مفرور حسرت سے چیختا ہے اور حقوق ضائع کرنے والا توبہ کی اور ظالم دنیا میں (تلافیٔ مافات کے لئے) واپس آنے کی آرزو کرتا ہے۔ حالانکہ جائے فرار مسدود ہو گئی۔ (تو اُس وقت تم کیا کرو گے) (ص ۲۹۱-۹۳)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

مجھے تمہاری ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے (کہ تم بیت المال کا کچھ حصہ اپنے صرف میں لے آئے ہو) تو تم نے اپنے پروردگار کو غضب ناک کیا۔ اپنے امام کی نافرمانی کی، اپنی امانتداری کو ذلیل کیا اور مسلمانوں کی خیانت کی۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم نے زمین کو ویران کر دیا۔ جو تمہارے قبضہ میں تھا وہ ہضم کر لیا اور جو تمہارے ہاتھ میں تھا وہ ہضم کر بیٹھے۔ (ص ۲۹۵)

اِس خط کے جواب میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کو لکھا:

آپ کو جو خبر ملی ہے، سراسر غلط ہے۔ میرے قبضے میں جو مال آیا ہے، وہ بجنسہٖ موجود ہے۔ اور مَیں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ (ص ۲۹۵) مَیں نے بیت المال سے جتنا مال لیا ہے، اس سے زیادہ میرا حصہ اس میں تھا۔ (ص ۲۹۹)

یہ تو رہیں وہ باتیں جو (ان خطوط کے مطابق) حضرت علیؓ نے دوسرے صحابہؓ کے متعلق ارشاد فرمائیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں آپ نے خود اپنے متعلق کہا، اور جو (ہمارے نزدیک) آپ کے علوِ مرتبت کے ہرگز شایاں نہیں (اس لئے وضعی ہیں) قرآن کریم نے حسب و نسب پر فخر کے جذبہ و احساس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور اس کی جگہ ذاتی جوہر اور بلندیٔ سیرت

تک صحبتِ نبویؐ سے مشرف رہے۔ مفسرِ قرآن اور راوئ حدیث تھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں شریک رہے۔

حضرت علیؓ نے آپ کے نام اپنے خط میں لکھا:۔

مَیں نے تمہیں اس لئے امانت (حکومت) میں شریک کیا تھا اور اپنا ہمدم و ہمراز بنایا تھا کہ میری نظر میں، میرے خاندان میں، تم سے زیادہ باوثوق کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ لیکن تم نے جب دیکھا کہ تمہارے ابن عم پر زمانہ سختیاں کر رہا ہے، اور دشمن برسرِ پیکار ہے، تو تم نے بھی اس کی حمایت سے منہ موڑ لیا اور دوسرے چھوڑنے والوں کی طرح تم نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ اور دیگر لوگوں کی طرح اس کی مدد نہ کی۔ اُمت کے جس مال پر تمہارا بس چلا، اسے تم نے اچک لیا، جیسے تیز رفتار بھیڑیا زخمی بکری کو اُڑا لے جاتا ہے۔ دیکھو ذرا ٹھہرو (اور سوچو) گویا تم اپنی عمر پوری کر چکے ہو، اور تمہارے اعمال تمہارے سامنے ایسی جگہ پیش کئے جا رہے ہیں جہاں مفرور حسرت سے چیختا ہے اور حقوق ضائع کرنے والا توبہ کی اور ظالم دنیا میں (تلافی مافات کے لئے) واپس آنے کی آرزو کرتا ہے۔ حالانکہ جائے فرار مسدود ہو گئی۔ (تو اُس وقت تم کیا کرو گے) (ص ۲۹۱-۹۳)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

مجھے تمہاری ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے (کہ تم بیت المال کا کچھ حصہ اپنے صرف میں لے آئے ہو) تو تم نے اپنے پروردگار کو غضبناک کیا۔ اپنے امام کی نافرمانی کی، اپنی امانتداری کو ذلیل کیا اور مسلمانوں کی خیانت کی۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم نے زمین کو ویران کر دیا۔ جو تمہارے قبضہ میں تھا وہ ہضم کیا اور جو تمہارے ہاتھ میں تھا وہ ہضم کر بیٹھے۔ (ص ۲۹۵)

اِس خط کے جواب میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کو لکھا:

آپ کو جو خبر ملی ہے، سراسر غلط ہے۔ میرے قبضے میں جو مال آیا ہے، وہ بجنسہٖ موجود ہے۔ اور مَیں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ (ص ۲۹۵) مَیں نے بیت المال سے جتنا مال لیا ہے، اس سے زیادہ میرا حصہ اس میں تھا۔ (ص ۲۹۹)

یہ تو رہیں وہ باتیں جو (ان خطوط کے مطابق) حضرت علیؓ نے دوسرے صحابہؓ کے متعلق ارشاد فرمائیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں آپ نے خود اپنے متعلق کہا، اور جو (ہمارے نزدیک) آپ کے علوِ مرتبت کے ہرگز شایاں نہیں (اس لئے وضعی ہیں) قرآن کریم نے حسب و نسب پر فخر کے جذبہ و احساس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور اس کی جگہ ذاتی جوہر اور بلندیٔ سیرت

کردار (تقویٰ) کو معیارِ تکریم قرار دیا۔ حضورؐ نبی اکرم نے بھی ساری عمر اس کی تلقین و تاکید فرمائی، اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ لیکن ان خطوط میں کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے، حضرت معاویہؓ سے کہا کہ:۔

> رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہم دونوں عبدِمناف کی اولاد ہیں تو ہم تم ایسے ہی ہیں — لیکن امیہ، ہاشم کے، حرب، عبدالمطلب کے اور ابوسفیان، ابوطالب کے برابر نہ تھے...... بلکہ ہمیں تو نبوت کا شرف بھی حاصل ہے۔ جس کے لئے ہم نے بڑے بڑے عزت دار (کافر) کو قتل کیا اور آزاد (کافر) لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالا۔ (صفحہ ۴۵۳-۴۵۲)

دوسرے مقام پر ہے:۔

> رہی میری فضیلتِ اسلام، قرابتِ رسولؐ اور شرافتِ قریش، تو اپنی جان کی قسم اگر تم میں اسے بھی مٹا ڈالنے کی طاقت ہوتی تو اسے بھی کبھی کے مٹا چکے ہوتے۔ (ص ۴۶۶)

اپنے حقِ خلافت کے سلسلہ میں اپنے ساتھیوں کے نام اپنے مراسلہ میں لکھا:۔

> جب آپؐ اس دارِفانی سے تشریف لے گئے تو امارت و خلافت کے سلسلے میں مسلمانوں میں جھگڑے پڑے بخدا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عرب اسے مجھ سے (اور کسی دوسری طرف) منتقل کر دیں گے۔ اس لئے لوگوں کے ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہونے اور ان پر ٹوٹ پڑنے سے مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے اپنا ہاتھ (بیعت سے) روکے رکھا۔ (کیونکہ) میں نے دیکھا کہ میں سب لوگوں میں سے اس شخص کے مقابلے میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا زیادہ حقدار ہوں جو مجھ پر حاکم مقرر ہوا ہے۔ لہٰذا جب تک اللہ نے چاہا میں اس پر قائم رہا۔ (میں نے بیعت نہیں کی) لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ بہت سے لوگ دین سے پھر گئے اور دینِ محمدیؐ و ملتِ ابراہیمیؑ کو مٹا دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں، تو مجھے خوف پیدا ہوا کہ اب بھی میں نے اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کی تو دین میں رخنے اور شکست و ریخت دیکھنا ہوگی اور وہ مصیبت میرے لئے اس حکومت کے نہ ملنے سے کہیں زیادہ ہوگی، جو ایک قلیل مدت کے سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے اور سراب کی طرح ایک دن زائل ہو جانے والی ہے۔ لہٰذا میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً جا کے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی اور ان کے دوش بدوش ان حادثات میں کام شروع کر دیا، یہاں تک کہ باطل نیست و نابود اور کفار کے علی الرغم کلمۂ الٰہی بلند ہو گیا۔ (ص ۴۵۹)

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے سلسلہ میں لکھا کہ جب لوگوں نے ان کی بیعت کر لی تو پھر:۔

کردار (تقویٰ) کو معیارِ تکریم قرار دیا۔ حضورؐ نبی اکرم نے بھی ساری عمر اس کی تلقین و تاکید فرمائی، اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ لیکن ان خطوط میں کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے، حضرت معاویہؓ سے کہا کہ:۔

> رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہم دونوں عبد مناف کی اولاد ہیں تو ہم تم ایسے ہی ہیں۔۔۔ لیکن امیہ، ہاشم کی، حرب، عبدالمطلب کے اور ابوسفیان، ابوطالب کے برابر نہ تھے۔۔۔۔۔ بلکہ ہمیں تو نبوت کا شرف بھی حاصل ہے۔ جس کے لئے ہم نے بڑے بڑے عزت دار (کافر) کو قتل کیا اور آزاد (کافر) لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالا۔ (ص [illegible])

دوسرے مقام پر ہے:۔

> رہی میری فضیلتِ اسلام، قرابتِ رسولؐ اور شرافتِ قریش، تو اپنی جان کی قسم اگر تم میں اسے بھی مٹا ڈالنے کی طاقت ہوتی تو اسے بھی کبھی کے مٹا چکے ہوتے۔ (ص [illegible])

اپنے حقِ خلافت کے سلسلہ میں اپنے ساتھیوں کے نام اپنے مراسلہ میں لکھا:۔

> جب آپؐ اس دارِ فانی سے تشریف لے گئے تو امارت و خلافت کے سلسلے میں مسلمانوں میں جھگڑے پڑے بخدا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عرب اسے مجھ سے (کسی دوسری طرف) منتقل کر دیں گے۔ اس لئے لوگوں کے ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہونے اور ان پر ٹوٹ پڑنے سے مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے اپنا ہاتھ (بیعت سے) روکے رکھا۔ (کیونکہ) میں نے دیکھا کہ میں سب لوگوں میں سے اس شخص کے مقابلے میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا زیادہ حقدار ہوں جو مجھ پر حاکم مقرر ہوا ہے۔ لہٰذا جب تک اللہ نے چاہا میں اس پر قائم رہا۔ (میں نے بیعت نہیں کی) لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ بہت سے لوگ دین سے پھر گئے اور دینِ محمدیؐ و ملتِ ابراہیمیؑ کو مٹا دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں، تو مجھے خوف پیدا ہوا کہ اب بھی میں نے اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کی تو دین میں رخنے اور شکستہ و ریخت دیکھنا ہوگی اور وہ مصیبت میرے لئے اس حکومت کے نہ ملنے سے کہیں زیادہ ہوگی، جو ایک قلیل مدت کے سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے اور سراب کی طرح ایک دن زائل ہو جانے والی ہے۔ لہٰذا میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً جا کے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی اور ان کے دوش بدوش ان حادثات میں کام شروع کر دیا، یہاں تک کہ باطل نیست و نابود اور کفار کے علی الرغم کلمۃ الٰہی بلند ہو گیا۔ (ص ۴۵۹)

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے سلسلہ میں لکھا کہ جب لوگوں نے ان کی بیعت کر لی تو میں:۔

مجھ سے بولے کہ علی رض آؤ تم بھی عثمان رض کی بیعت کرو، ورنہ ہم تم سے جہاد کریں گے۔ لہٰذا مجھے بادلِ نخواستہ بیعت کرنا پڑی اور حسبتہً اللہ صبر کر لیا۔ ایک صاحب نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ فرزندِ ابی طالب، تم خلافت کے بڑے حریص ہو۔ بھی تو اپنے بھائی کی میراث اور اس کا حق طلب کر رہا تھا، تم اس میراث اور میرے درمیان بلاوجہ حائل ہو گئے اور مجھے اس کی طرف سے ہٹا رہے ہو۔ اے خدائے تعالیٰ میں قریش کے مقابلہ میں تجھ سے اعانت کا خواستگار ہوں! دیکھ! ان لوگوں نے مجھ سے قطع رحم کر لیا، میرے بلند مرتبے اور فضیلت کو گھٹا دیا اور میرا وہ حق مجھ سے چھین لینے میں متحد ہو گئے جس کا میں ان سے کہیں زیادہ حقدار ہوں۔ (صفحہ ۲۶۳-۲۶۱)

یہ ہیں (نمونۃً) ان خطوط کے چند ایک اقتباسات جنہیں یہ کہہ کر شائع کیا گیا ہے کہ انہیں حضرت علی رض نے تحریر فرمایا تھا۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اس سازش کا ایک حصہ تھا جس سے (تاریخ کو مسخ کر کے) یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جس درخت کے برگ و بار اس قسم کے ہوں، اس درخت کے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے! ہماری تاریخ کا یہی وہ دَور ہے (صدرِ اوّل یا دورِ صحابہ کبار رض) ہے۔ جسے ہم دنیا کے سامنے بصد فخر و ناز پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ خطوط، اس دور کے متعلق جس قسم کا نقشہ سامنے لاتے ہیں، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ (جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے) اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا ہم خود اپنے زمانے کے میدانِ سیاست میں کھڑے ہیں، جس میں ایک پارٹی، دوسری پارٹی پر (معاذ اللہ) گند اچھال رہی ہے۔ ان خطوط کی رُو سے، اگر یہ سچ تسلیم کر لیا جائے کہ جو کچھ حضرت علی رض نے لکھا تھا، وہ صحیح تھا، تو اس سے اس قدر جلیل القدر صحابہ رض کا جو کردار سامنے آتا ہے، ظاہر ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رض کے عائد کردہ یہ الزامات بے بنیاد تھے، تو حضرت علی رض اور آپ کے طرفدار صحابہ رض کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بھی کم تاسف انگیز نہیں۔ پھر، خطوط کا جو انداز ہے وہ کبھی حضرت علی رض جیسے بزرگ کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ (اس سے خود ان خطوط کے وضعی ہونے کی شہادت ملتی ہے۔)

جماعتِ اسلامی کے اشاعتی ادارہ نے جس مقصد کے لئے ان (سراسر وضعی) خطوط کو شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ خطوط:-

(۱) مودودی صاحب کے پیشِ نظر مقصد کی تائید و تقویت کا موجب بنتے ہیں جس کی رُو سے وہ دنیا کی نظروں میں اسلام کو رسوا کرنے کی مہم کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو، ان کی رسوائے عالم تصنیف ـــــ خلافت و ملوکیت ـــــ کا تکملہ سمجھئے۔

(۲) جماعتِ اسلامی کا مؤقف یہ ہے کہ معاشرہ میں جس قدر صالح، متقی، پرہیزگار، بلند سیرت و کردار کے

مجھ سے بولے کہ علیؓ آؤ تم بھی عثمانؓ کی بیعت کرو، ورنہ ہم تم سے جہاد کریں گے۔ لہٰذا مجھے بادلِ نخواستہ بیعت کرنا پڑی اور حسبۃ اللہ صبر کر لیا۔ ایک صاحب نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ فرزندِ ابی طالب، تم خلافت کے بڑے حریص ہو۔ میں تو اپنے بھائی کی میراث اور اس کا حق طلب کر رہا تھا، تم اس میراث اور میرے درمیان بلاوجہ حائل ہو گئے اور مجھے اس کی طرف سے ہٹا رہے ہو۔ اے خدائے تعالیٰ میں قریش کے مقابلہ میں تجھ سے اعانت کا خواستگار ہوں! دیکھ! ان لوگوں نے مجھ سے قطع رحم کر لیا، میرے بلند مرتبے اور فضیلت کو گھٹا دیا اور میرا وہ حق مجھ سے چھین لینے میں متحد ہو گئے جس کا میں ان سے کہیں زیادہ حقدار ہوں۔ (ص ۲۶۱ - ۲۶۳)

یہ ہیں (نمونتہً) ان خطوط کے چند ایک اقتباسات جنہیں یہ کہہ کر شائع کیا گیا ہے کہ انہیں حضرت علیؓ نے تحریر فرمایا تھا۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اس سازش کا ایک حصہ تھا جس سے (تاریخ کو مسخ کر کے) یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جس درخت کے برگ و بار اس قسم کے ہوں، اس درخت کے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے! ہماری تاریخ کا یہی وہ دور ہے (صدرِ اوّل یا دورِ صحابہ کبارؓ) ہے۔ جسے ہم دنیا کے سامنے بصد فخر و ناز پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ خطوط، اس دور کے متعلق جس قسم کا نقشہ سامنے لاتے ہیں، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ (جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے) اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا ہم خود اپنے زمانے کے میدانِ سیاست میں کھڑے ہیں، جس میں ایک پارٹی، دوسری پارٹی پر (معاذ اللہ) گند اچھال رہی ہے۔ ان خطوط کی رُو سے، اگر یہ سچ تسلیم کر لیا جائے کہ جو کچھ حضرت علیؓ نے لکھا تھا، وہ صحیح تھا، تو اس سے اس قدر جلیل القدر صحابہؓ کا جو کردار سامنے آتا ہے، ظاہر ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ کے عائد کردہ یہ الزامات بے بنیاد تھے، تو حضرت علیؓ اور آپ کے طرفدار صحابہؓ کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بھی کم تاسف انگیز نہیں۔ پھر، خطوط کا جو انداز ہے وہ کبھی حضرت علیؓ جیسے بزرگ کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ (اس سے خود ان خطوط کے وضعی ہونے کی شہادت ملتی ہے۔)

جماعتِ اسلامی کے اشاعتی ادارہ نے جس مقصد کے لئے ان (سراسر وضعی) خطوط کو شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ خطوط:-

(۱) مودودی صاحب کے پیشِ نظر مقصد کی تائید و تقویت کا موجب بنتے ہیں جس کی رُو سے وہ دنیا کی نظروں میں اسلام کو رسوا کرنے کی مہم کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو، ان کی رسوائے عالم تصنیف ـــــ خلافت و ملوکیت ـــــ کا تکملہ سمجھئے۔

(۲) جماعتِ اسلامی کا مؤقف یہ ہے کہ معاشرہ میں جس قدر صالح، متقی، پرہیزگار، بلند سیرت و کردار کے

مالک انسان ہیں، وہ اس جماعت میں شامل ہیں۔ جو اس جماعت سے باہر ہیں، وہ دنیا بھر کی برائیوں، خباثتوں کے پلندے ہیں۔ ان (وضعی) خطوط سے ان کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے، جن میں بعینہٖ یہی مؤقف اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) جماعتِ اسلامی کا انداز یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ان کے ساتھ رہتا ہے، وہ امت کا صالح ترین فرد قرار پاتا ہے۔ اگر وہ (بدقسمتی سے) ان سے اختلاف کرے، الگ ہو جاتا ہے تو اسے سر سے پاؤں تک عیوب و ذمائم کا پیکر بنا دیا جاتا ہے۔ ان (وضعی) خطوط سے انہیں اپنی اس روش کی بھی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

(۴) جماعت اسلامی کا بنیادی مؤقف یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کی منشاء کے مطابق حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ ان کے سوا، ہر پارٹی یا طبقہ کی حکومت ابلیسی قرار پاتی ہے۔ ان (وضعی) خطوط سے اس جماعت کو اپنے اس مسلک کی بھی تائید ملتی ہے۔

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے لئے جماعت اسلامی کے اس ادارہ نے ان (وضعی) خطوط کو شائع کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اس کے لئے "معذرت ملاحظہ فرمائیے۔" عرضِ ناشر" کے تحت کہا گیا ہے:

> مکتوبات کے موضوع، اندازِ تخاطب و بیان کے بارے میں مرتب و ناشر کا کوئی تعلق نہیں۔ صحابی، صحابی کے مرتبہ و مقام کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جناب امیرؓ خود صحابی تھے اور ان کے مخاطب زیادہ تر صحابہ کرامؓ ہی تھے۔ وہ ہم سے بہتر سمجھتے تھے کہ کیا انداز اختیار فرمائیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف اتنی بات ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ کے رشحاتِ گرامی کو اُردو داں طبقہ کے سامنے پیش کر سکیں۔ (صفحہ ۵)

یہ "عذرِ گناہ" کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ اب آیئے، ان خطوط کے مرتب اور مترجم (حکیم نبی احمد خانصاحب) کی طرف۔ وہ کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

> میں یہ عرض کر دینا بھی نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی اس کاوش میں صرف روایت کو پیشِ نظر رکھا ہے، درایت سے قطعاً کام نہیں لیا۔ مجھے معتبر یا غیر معتبر، قدیم یا جدید، جس ذریعے سے بھی کوئی مکتوب ملا، میں نے اسے بلا تحقیق و تنقید صرف حوالے پر اکتفا کر کے اپنے مجموعے میں شامل کر لیا۔ (صفحہ ۲۱)

مرحبا! جزاک اللہ! بڑا مبارک کام کیا آپ نے۔ اُمت کو آپ کا شکر گذار ہی نہیں، احسان مند ہونا چاہیئے کہ آپ نے ایسی جلیل القدر خدمت سرانجام دی، جو اسلام کے بدترین مخالف، مستشرقین سے بھی بن نہ پڑی تھی۔ وہ بھی تو اپنی اسی قسم کی "خدماتِ جلیلہ" کے ضمن میں یہی کیا کرتے ہیں کہ ہم نے جو حوالے پیش کئے ہیں، آپ انہیں چیک کر لیجئے۔ اگر وہ صحیح ہیں تو پھر ہمیں کوئی موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا۔ درایت ہمارا کام نہیں۔

لیکن ہم جناب مرتب و مترجم سے صرف ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ نے

مالک انسان ہیں، وہ اس جماعت میں شامل ہیں۔ جو اس جماعت سے باہر ہیں، وہ دنیا بھر کی برائیوں، خباثتوں کے پلندے ہیں۔ ان (وضعی) خطوط سے ان کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے، جن میں بعینہٖ یہی مؤقف اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) جماعتِ اسلامی کا انداز یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ان کے ساتھ رہتا ہے، وہ امت کا صالح ترین فرد قرار پاتا ہے۔ اگر وہ (بدقسمتی سے) ان سے اختلاف کرے، الگ ہو جاتا ہے تو اسے سر سے پاؤں تک عیوب و ذمائم کا پیکر بنا دیا جاتا ہے۔ ان (وضعی) خطوط سے انہیں اپنی اس روش کی بھی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

(۴) جماعت اسلامی کا بنیادی مؤقف یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کی منشاء کے مطابق حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ ان کے سوا، ہر پارٹی یا طبقہ کی حکومت ابلیسی قرار پاتی ہے۔ ان (وضعی) خطوط سے اس جماعت کو اپنے اس مسلک کی بھی تائید ملتی ہے۔

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے لئے جماعت اسلامی کے ادارہ نے ان (وضعی) خطوط کو شائع کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اس کے لئے "معذرت ملاحظہ فرمائیے۔ "عرضِ ناشر" کے تحت کہا گیا ہے:

> مکتوبات کے موضوع، اندازِ تخاطب و بیان کے بارے میں مرتب و ناشر کا کوئی تعلق نہیں۔ صحابی، صحابی کے مرتبہ و مقام کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جناب امیرؓ خود صحابیؓ تھے اور ان کے مخاطب زیادہ تر صحابہ کرام رضؓ ہی تھے۔ وہ ہم سے بہتر سمجھتے تھے کہ کیا انداز اختیار فرمائیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف اتنی بات ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ کے رشحاتِ گرامی کو اُردو داں طبقہ کے سامنے پیش کر سکیں۔ (صفحہ ۵)

یہ "عذرِ گناہ" کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ اب آیئے، ان خطوط کے مرتب اور مترجم (حکیم نبی احمد خانصاحب) کی طرف۔ وہ کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

> مَیں یہ عرض کر دینا بھی نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ مَیں نے اپنی اس کاوش میں صرف روایت کو پیشِ نظر رکھا ہے، درایت سے قطعاً کام نہیں لیا۔ مجھے معتبر یا غیر معتبر، قدیم یا جدید، جس ذریعے سے بھی کوئی مکتوب ملا، میں نے اسے بلا تحقیق و تنقید صرف حوالے پر اکتفا کر کے اپنے مجموعے میں شامل کر لیا۔ (صفحہ ۲۱)

مرحبا! جزاک اللہ! بڑا مبارک کام کیا آپ نے۔ اُمت کو آپ کا شکر گذار ہی نہیں، احسان مند ہونا چاہیئے کہ آپ نے ایسی جلیل القدر خدمت سرانجام دی، جو اسلام کے بدترین مخالف، مستشرقین سے بھی بن نہ پڑی تھی۔ وہ بھی تو اپنی اسی قسم کی "خدماتِ جلیلہ" کے ضمن میں یہی کیا کرتے ہیں کہ ہم نے جو حوالے پیش کئے ہیں، آپ انہیں چیک کر لیجئے۔ اگر وہ صحیح ہیں تو پھر ہمیں کوئی موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا۔ درایت ہمارا کام نہیں۔

لیکن ہم جناب مرتب و مترجم سے صرف ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ نے

ان خطوط کے سلسلہ میں درایت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہت اچھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عظیم میں ان صحابہؓ کے متعلق جو شہادت اور ضمانت دی ہے، کیا آپ نے اتنا غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ آپ کی اس "کاوش" سے اس شہادت و ضمانتِ خداوندی کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ کیا آپ کو اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ کل (روزِ حساب) کو جب خدا آپ سے پوچھے گا کہ ہم نے ان (صحابہ رضؓ) کی سیرت و کردار کے متعلق، تو یہ گواہی دی تھی، اور تم نے ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جو ہماری گواہی کو جھوٹا ثابت کرتی تھیں، تو اس وقت آپ کا جواب کیا ہو گا؟ کیا آپ کا یہ جواب عدالتِ خداوندی میں قابلِ پذیرائی ہوگا کہ مجھے تاریخ میں، رطب و یابس، جو کچھ ملا میں نے اسے بلا تحقیق و تنقید پیش کر دیا؟

ہم ان صاحب سے واقف نہیں، ورنہ ان سے اتنا ضرور پوچھتے کہ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر مقصد تو قابلِ فہم ہے، لیکن آپ کو اس قسم کی سازش کرنے والے عناصر کے ایجنٹ بننے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی، جو ان کے ساتھ اپنا اعمال نامہ بھی سیاہ کر لیا!

جسدِ اسلام کے لئے ہماری یہ تاریخ بھی عجیب قسم کا سرطان (CANCER) بن چکی ہے۔ سازشیوں کے ایک گروہ نے پہلے اس قسم کی تاریخ مرتب کی ـــــ صدرِ اوّل سے کوئی دو اڑھائی سو سال بعد، کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر ـــــ اب جو شخص اس سازش کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس تاریخ کو سند کے طور پہ پیش کر دیتا ہے۔ جب اس پہ کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ نہایت معصومانہ انداز سے کہہ دیتا ہے کہ میں اپنی طرف سے یہ کچھ تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ یہ تو ہماری تاریخ میں لکھا ہے۔ اگر میرا کوئی حوالہ غلط ہو تو جو سزا چور کی ہو میری۔ اور اس سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کی بات "مستند" ہو گئی، کیونکہ اس نے تاریخ کے صحیح حوالے پیش کر دیئے! غور کیا آپ نے کہ تاریخ کے اس سرطان نے اپنا جال کہاں تک پھیلا رکھا ہے!

یاد رکھئے! جو شخص صدرِ اوّل (دورِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ) کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار، قرآنِ کریم کو قرار نہیں دیتا، وہ اسلام، اور حضورؐ رسالتمآب کے خلاف اس سازش کو کامیاب بنانے میں برابر کا شریک ہے۔

دفتر طلوعِ اسلام سے ہر پرچہ کئی بار چیک کرنے کے بعد ڈاک کے حوالہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی شکایت ماہِ رمضان کی ۱۵ تاریخ تک مل جانے پر پرچہ بلا قیمت بھیج دیا جاتا ہے۔ بعد میں آمدہ شکایات پر (بشرطِ موجودگی) قیمتاً بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

ان خطوط کے سلسلہ میں درایت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہت اچھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عظیم میں ان صحابہؓ کے متعلق جو شہادت اور ضمانت دی ہے، کیا آپ نے اتنا غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ آپ کی اس "کاوش" سے اس شہادت و ضمانتِ خداوندی کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ کیا آپ کو اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ کل (دورِ حساب) کو جب خدا آپ سے پوچھے گا کہ ہم نے ان (صحابہؓ) کی سیرت و کردار کے متعلق، تو یہ گواہی دی تھی، اور تم نے ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جو ہماری گواہی کو جھوٹا ثابت کرتی تھیں، تو اس وقت آپ کا جواب کیا ہو گا؟ کیا آپ کا یہ جواب عدالتِ خداوندی میں قابلِ پذیرائی ہو گا کہ مجھے تاریخ میں، رطب و یابس، جو کچھ ملا میں نے اسے بلا تحقیق و تنقید پیش کر دیا؟

ہم ان صاحب سے واقف نہیں، ورنہ ان سے اتنا ضرور پوچھتے کہ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر مقصد تو قابلِ فہم ہے، لیکن آپ کو اس قسم کی سازش کرنے والے عناصر کے ایجنٹ بننے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی، جو ان کے ساتھ اپنا اعمال نامہ بھی سیاہ کر لیا!

جسدِ اسلام کے لئے ہماری یہ تاریخ بھی عجیب قسم کا سرطان (CANCER) بن چکی ہے۔ سازشیوں کے ایک گروہ نے پہلے اس قسم کی تاریخ مرتب کی ـــــ صدرِ اوّل سے کوئی دو اڑھائی سو سال بعد، کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر ـــــ اب جو شخص اس سازش کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس تاریخ کو سند کے طور پہ پیش کر دیتا ہے۔ جب اس پہ کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ نہایت معصومانہ انداز سے کہہ دیتا ہے کہ میں اپنی طرف سے یہ کچھ تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ یہ تو ہماری تاریخ میں لکھا ہے۔ اگر میرا کوئی حوالہ غلط ہو تو جو سزا چور کی سو میری۔ اور اس سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کی بات "مستند" ہو گئی، کیونکہ اس نے تاریخ کے صحیح حوالے پیش کر دیئے! غور کیا آپ نے کہ تاریخ کے اس سرطان نے اپنا جال کہاں تک پھیلا رکھا ہے!

یاد رکھئے! جو شخص صدرِ اوّل (دورِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ) کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار، قرآنِ کریم کو قرار نہیں دیتا، وہ اسلام، اور حضورؐ رسالتمآبؐ کے خلاف اس سازش کو کامیاب بنانے میں برابر کا شریک ہے۔

دفتر طلوعِ اسلام سے ہر پرچہ کئی بار چیک کرنے کے بعد ڈاک کے حوالہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی شکایت ماہِ رواں کی ۱۵ تاریخ تک مل جانے پر پرچہ بلا قیمت بھیج دیا جاتا ہے۔ بعد میں آمدہ شکایات پر (بشرطِ موجودگی) قیمتاً بھیجا جائے گا۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

محترم مولانا غلام مرشد صاحب مدظلہ العالی

قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید

پیرانہ سالی اور اس پر مختلف عوارض کے ہجوم نے پہلے ہی مضمحل کر رکھا تھا جو گذشتہ دنوں مسلسل بخار کی شدت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اور نقاہت اس قدر بڑھ گئی کہ تھوڑے سے وقت کے لئے بات چیت کرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ جسمانی کوفت تو تھی ہی لیکن اس دوران میں دو ایک باتیں ایسی نظروں سے گذریں جنہوں نے انتہائی روحانی کرب پیدا کر دیا۔ سوچتا تھا کہ اگر تھوڑی سی سکت بھی پیدا ہو جائے تو میں کم از کم اپنی ایک شہادت کو تحمید کر کے محفوظ کر جاؤں جس سے ثابت ہو سکے کہ محسنِ ملت قائدِ اعظمؒ کا قرآن حکیم کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا۔ اِس احساس کی شدت، اِس خیال سے اور بھی بڑھ گئی کہ کل قیامت کے دن کم از کم اس باز پرس سے بچ جاؤں کہ جب یہ اتنی بڑی شہادت تمہارے پاس موجود تھی تو تم اسے اپنے سینے میں مستور رکھ کر دنیا سے کیوں چلے آئے۔ لیکن میری نقاہت راستے میں بُری طرح حائل تھی۔ اِس مشکل کا حل میرے واجب الاحترام دوست پرویز صاحب نے پیش کر دیا۔ انہوں نے مزاج پرسی کے لئے ٹیلی فون کیا تو مَیں نے ان سے اپنے اس کرب کا اظہار بھی کیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اپنے ایک معاون کو آپ کی خدمت میں بھیجے دیتا ہوں۔ آپ جو کچھ لکھنا چاہیں اِنہیں املا کرا دیجئے۔ چنانچہ مَیں ان کے شکریے کے ساتھ یہ الفاظ املا کرا رہا ہوں تاکہ یہ اس کے بعد طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ ہو جائیں۔

پہلی چیز جو میرے لئے اس روحانی کرب کا باعث ہوئی وہ جماعتِ اسلامی کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ تثلیث تھی ـــــ یعنی یہ کہ ایک جداگانہ مملکت کا خیال اقبالؒ نے دیا۔ پاکستان کا نظریہ مودودی صاحب نے عطا فرمایا اور محمد علی جناحؒ نے اس کے مطابق ایک مملکت حاصل کر لی۔ اس قسم کی ایک تثلیث عیسائیوں نے بھی متشکل کی تھی ـــــ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس ـــــ شروع میں تو یہ اقنوم ثلاثہ برابر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ باپ اور روح القدس بیٹے میں حلول کر گئے اور عیسائیت کا ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ ساری دنیا کا مدار علیہ حضرت مسیحؑ ہی رہ گئے۔ اِس جدید تثلیث کے پیش کرنے والے جس بُری طرح سے پہلے تحریکِ پاکستان کے اور اب مملکتِ پاکستان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اس کی روشنی میں یوں نظر آتا ہے کہ

محترم مولانا غلام مرشد صاحب مدظلہ العالی

قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید

پیرانہ سالی اور اس پر مختلف عوارض کے ہجوم نے پہلے ہی مضمحل کر رکھا تھا جو گذشتہ دنوں مسلسل بخار کی شدت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اور نقاہت اس قدر بڑھ گئی کہ تھوڑے سے وقت کے لئے بات چیت کرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ جسمانی کوفت تو تھی ہی لیکن اس دوران میں دو ایک باتیں ایسی نظروں سے گذریں جنہوں نے انتہائی روحانی کرب پیدا کر دیا۔ سوچتا تھا کہ اگر تھوڑی سی سکت بھی پیدا ہو جائے تو میں کم از کم اپنی ایک شہادت کو تکمیند کر کے محفوظ کر جاؤں جس سے ثابت ہو سکے کہ محسنِ ملت قائدِ اعظمؒ کا قرآن حکیم کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا۔ اِس احساس کی شدت، اِس خیال سے اور بھی بڑھ گئی کہ کل قیامت کے دن کم از کم اس باز پرس سے بچ جاؤں کہ جب یہ اتنی بڑی شہادت تمہارے پاس موجود تھی تو تم اسے اپنے سینے میں مستور رکھ کر دنیا سے کیوں چلے آئے۔ لیکن میری نقاہت راستے میں بُری طرح حائل تھی۔ اِس مشکل کا حل میرے واجب الاحترام دوست پرویز صاحب نے پیش کر دیا۔ انہوں نے مزاج پرسی کے لئے ٹیلی فون کیا تو میں نے ان سے اپنے اس کرب کا اظہار بھی کیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اپنے ایک معاون کو آپ کی خدمت میں بھیجے دیتا ہوں۔ آپ جو کچھ لکھنا چاہیں اِنہیں املا کرا دیجئے۔ چنانچہ میں ان کے شکریے کے ساتھ یہ الفاظ املا کرا رہا ہوں تاکہ یہ اس کے بعد طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ ہو جائیں۔

پہلی چیز جو میرے لئے اس روحانی کرب کا باعث ہوئی وہ جماعتِ اسلامی کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ تثلیث تھی ـــــ یعنی یہ کہ ایک جداگانہ مملکت کا خیال اقبالؒ نے دیا۔ پاکستان کا نظریہ مودودی صاحب نے عطا فرمایا اور محمد علی جناحؒ نے اس کے مطابق ایک مملکت حاصل کر لی۔ اس قسم کی ایک تثلیث عیسائیوں نے بھی متشکل کی تھی ـــــ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس ـــــ شروع میں تو یہ اقنوم ثلاثہ برابر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ باپ اور روح القدس بیٹے میں حلول کر گئے اور عیسائیت کا ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ ساری دنیا کا مدار علیہ حضرت مسیحؑ ہی رہ گئے۔ اِس جدید تثلیث کے پیش کرنے والے جس بُری طرح سے پہلے تحریکِ پاکستان کے اور اب مملکتِ پاکستان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اس کی روشنی میں یوں نظر آتا ہے کہ

رفتہ رفتہ اس مثلث کے چھوٹے دونوں ضلع ـــــ یعنی اقبالؒ اور جناحؒ، ختم کر دیئے جائیں گے اور ان کے معزز مقتدی ـــــ مودودی صاحب ـــــ بخطِ مستقیم بن کر بانیٔ پاکستان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ جائیں گے۔ تاریخ میں اس قسم کی تفنیخ و تحریف کوئی نیا واقعہ نہیں۔

دوسرا واقعہ، جس نے میرے اس کرب کو شدید ترین درد میں بدل دیا، مودودی صاحب کا یہ ارشادِ گرامی تھا کہ قائدِ اعظمؒ کا پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا دعویٰ بھی محض فراڈ اور فریب تھا۔ مجھے الم انگیز کرب اس احساس سے تھا کہ یہ نابکار، ایسا کچھ سننے کے لئے زندہ کیوں رہا؟ اور اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کیوں نہ ہو گیا۔ قائدِ اعظمؒ کا قرآن مجید کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا اور وہ اس باب میں کس قدر مخلص تھے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں اس میں ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جسے میں نے اپنی شہادت کہہ کر پکارا ہے۔ سنہ ۱۹۴۵ء کے آخری ثلث کی بات ہے جب قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ ممدوٹ ولاؔ (لاہور) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن جب میں اپنے مکان ـــــ چبالہ نمبر A/1051 میں بیٹھا ہوا تھا، قائدِ اعظمؒ کا ایک نمائندہ میرے پاس پہنچا اور کہا کہ قائدِ اعظمؒ نے مجھ خاکسار کو فوری طور پر یاد فرمایا ہے۔ میں فوراً چلنے کے لئے تیار ہوا، لیکن پھر خیال آیا کہ ـــــ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ـــــ میں انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا اور قائدِ اعظمؒ شاید میری زبان کو پوری طرح سمجھ نہ پائیں تو باہمی گفتگو کا نقشہ کیا ہوگا۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس مسٹر ایم مسعود کھدر (سابق آئی سی ایس، جو اس زمانے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے) بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساتھ چلنے کے لئے کہا کہ وہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہم ممدوٹ ولاؔ پہنچے تو قائدِ اعظمؒ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس کا دروازہ بڑے ہال کی طرف بھی کھلتا تھا، میرے منتظر بیٹھے تھے۔ سلام مسنون کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بڑے اہم دینی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ جمعیت العلمائے ہند (دہلی) جس کے سرپرست مفتی کفایت اللہ مرحوم، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے نیشنلسٹ علماء، برسوں سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں، بہت سے علماء ہمارے ہم نوا بھی ہیں لیکن ان کی کوئی تنظیم نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری تھی کہ ان علماء پر مشتمل ایک متوازی جمعیت قائم کی جائے۔ اس کا مرکز کلکتہ تجویز پایا اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کر دی گئیں۔ اس کا افتتاحی اجلاس چند دنوں کے بعد کلکتہ میں ہونا قرار پایا۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں دعوت نامے بھی جاری کر دیئے اور مولانا راغب احسن (مرحوم) کے زیرِ سرکردگی جملہ انتظامات بھی مکمل کر لئے گئے۔ اس جمعیت کے نامزد صدر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کا افتتاح کرنا تھا۔ سوءِ اتفاق سے وہ دیوبند میں علیل ہو گئے ہیں۔ جمعیت کے اجلاس میں چند روز باقی ہیں۔ وہ اس میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے اپنے مخصوص "جرنیلی" انداز میں فرمایا کہ

رفتہ رفتہ اس مثلث کے چھوٹے دونوں ضلع ــــــ یعنی اقبالؒ اور جناحؒ، ختم کر دیئے جائیں گے اور ان کے معزز مقتدی ــــــ مودودی صاحب ــــ خطِ مستقیم بن کر بانیٔ پاکستان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ جائیں گے۔ تاریخ میں اس قسم کی تنسیخ و تحریف کوئی نیا واقعہ نہیں۔

دوسرا واقعہ، جس نے میرے اس کرب کو شدید ترین درد میں بدل دیا، مودودی صاحب کا یہ ارشادِ گرامی تھا کہ قائدِ اعظمؒ کا پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا دعویٰ بھی محض فراڈ اور فریب تھا۔ مجھے الم انگیز کرب اس احساس سے تھا کہ یہ ناہنجار، ایسا کچھ سننے کے لئے زندہ کیوں رہا اور اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کیوں نہ ہو گیا۔ قائدِ اعظمؒ کا قرآن مجید کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا اور وہ اس باب میں کس قدر مخلص تھے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں اس میں ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جسے میں نے اپنی شہادت کہہ کر پکارا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے آخری ثلث کی بات ہے جب قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ ممدوٹ ولاؔ (لاہور) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن جب میں اپنے مکان ــــ چابلہ نمبر 1051/A میں بیٹھا ہوا تھا، قائدِ اعظمؒ کا ایک نمائندہ میرے پاس پہنچا اور کہا کہ قائدِ اعظمؒ نے مجھ خاکسار کو فوری طور پہ یاد فرمایا ہے۔ میں فوراً چلنے کے لئے تیار ہوا، لیکن پھر خیال آیا کہ ــــ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ــــ میں انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا اور قائدِ اعظمؒ شاید میری زبان کو پوری طرح سمجھ نہ پائیں تو باہمی گفتگو کا نقشہ کیا ہوگا۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس مسٹر ایم مسعود کھدر (سابق آئی سی ایس، جو اس زمانے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے) بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساتھ چلنے کے لئے کہا کہ وہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہم ممدوٹ ولاؔ پہنچے تو قائدِ اعظمؒ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس کا دروازہ بڑے ہال کی طرف بھی کھلتا تھا، میرے منتظر بیٹھے تھے۔ سلام مسنون کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بڑے اہم دینی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ جمعیت العلمائے ہند (دہلی) جس کے سرپرست مفتی کفایت اللہ (مرحوم) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے نیشنلسٹ علماء، برسوں سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں، بہت سے علماء ہمارے ہم نوا بھی ہیں لیکن ان کی کوئی تنظیم نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری تھی کہ ان علماء پر مشتمل ایک متوازی جمعیت قائم کی جائے۔ اس کا مرکز کلکتہ تجویز پایا اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کر دی گئیں۔ اس کا افتتاحی اجلاس چند دنوں کے بعد کلکتہ میں ہونا قرار پایا۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں دعوت نامے بھی جاری کر دیئے اور مولانا راغب احسن (مرحوم) کے زیرِ سرکردگی جملہ انتظامات بھی مکمل کر لئے گئے۔ اس جمعیت کے نامزد صدر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کا افتتاح کرنا تھا، سوءِ اتفاق سے وہ دیوبند میں علیل ہو گئے ہیں۔ جمعیت کے اجلاس میں چند روز باقی ہیں۔ وہ اس میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے اپنے مخصوص "جرنیلی" انداز میں فرمایا کہ

تم جلد از جلد خطبۂ افتتاحیہ تیار کرو اور ۲۴/۲۵ اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جاؤ۔ وہ ضابطہ کے اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کہا کہ تم "شعبۂ عمومی سیاست" میں میرے نائب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرو اور اس ضروری دینی خدمت کو سرانجام دو۔ خاکسار نے ان کی اس سرفرازی پر شکریہ ادا کیا اور اس ضرورت کو اپنا اہم ترین فریضہ سمجھ کر رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو۔ جس شخص کے نائب بن کر تم وہاں جا رہے ہو اس کی پوزیشن کے متعلق چند بنیادی نکتے ذہن میں رکھ کر وہاں جاؤ۔ اُن کے سامنے میز پر قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمہ کا نسخہ رکھا تھا۔ آپ نے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتابِ عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، اٹل اور دائمی قواعد موجود ہیں۔ عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے اٹل قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے ابدی ضوابط موجود ہیں۔ لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کرے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے کہا، قرآنِ کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر مَیں نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ذہن میں غالباً قرآنِ کریم کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) اس پر انہوں نے فوراً قرآنِ مجید کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا کہ بے شک یہی آیت میرے ذہن میں تھی۔ اس کے بعد کہا کہ دیکھو یہ ایک اصولی حکم ہے اور ابدی۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ معاشرہ کے عام حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کیا ہونی چاہئے جو قرآن کے اس اصول کے مطابق ہو۔ سب سے پہلے رسول اللہ نے یہ ضمنی قوانین مرتب فرمائے۔

اِس پر میں نے پھر سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ نے ایسا کچھ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کیا تھا جس کی رو سے کہا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) انہوں نے پھر قرآنِ کریم کو کھولا اور اس آیت کو نکال کر کہا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اگر قرآنِ مجید کے اصولی احکام کے جزئی قوانین مرتب کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو مشاورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ کے بعد اُمت کو بھی اسی طرح تدوینِ قوانین کرنی ہوگی۔ مَیں نے عرض کیا کہ اس کے لئے بھی خدا کا حکم موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) انہوں نے پھر قرآنِ کریم سے یہ آیت نکالی اور کہا کہ خدا کی یہ ہدایت ہماری راہنمائی کے لئے کس قدر واضح ہے۔ اسلامی مملکت، جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ کے آئین کی بنیاد یہی ہوگی۔

قائدِ اعظمؒ ان باتوں میں مصروف تھے اور کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ کے اراکین ضروری کاموں کے لئے مضطرب تھے۔ اس پر مَیں نے اٹھنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے

تم جلد از جلد خطبۂ افتتاحیہ تیار کرو اور ۲۴/۲۵ اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جاؤ۔ وہ ضابطے کے اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کہا کہ تم "شعبۂ عمومی سیاست" میں میرے نائب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرو اور اس ضروری دینی خدمت کو سرانجام دو۔ خاکسار نے ان کی اس سرفرازی پر شکریہ ادا کیا اور اس ضرورت کو اپنا اہم ترین فریضہ سمجھ کر رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو۔ جس شخص کے نائب بن کر تم وہاں جا رہے ہو اس کی پوزیشن کے متعلق چند بنیادی نکتے ذہن میں رکھ کر وہاں جاؤ۔ آن کے سامنے میز پر قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کا نسخہ رکھا تھا۔ آپ نے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتابِ عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، اٹل اور دائمی قواعد موجود ہیں۔ عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے اٹل قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے ابدی ضوابط موجود ہیں۔ لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کرے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے کہا، قرآن کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ذہن میں غالباً قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) اس پر انہوں نے فوراً قرآن مجید کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا کہ بے شک یہی آیت میرے ذہن میں تھی۔ اس کے بعد کہا کہ دیکھو یہ ایک اصولی حکم ہے اور ابدی۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ معاشرہ کے عام حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کیا ہونی چاہئے جو قرآن کے اس اصول کے مطابق ہو۔ سب سے پہلے رسول اللہ نے یہ ضمنی قوانین مرتب فرمائے۔

اس پر میں نے پھر سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ نے ایسا کچھ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کیا تھا جس کی رو سے کہا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) انہوں نے پھر قرآن کریم کو کھولا اور اس آیت کو نکال کر کہا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اگر قرآن مجید کے اصولی احکام کے جزئی قوانین مرتب کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو مشاورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ کے بعد امت کو بھی اسی طرح تدوینِ قوانین کرنی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے لئے بھی خدا کا حکم موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) انہوں نے پھر قرآن کریم سے یہ آیت نکالی اور کہا کہ خدا کی یہ ہدایت ہماری راہنمائی کے لئے کس قدر واضح ہے۔ اسلامی مملکت، جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے آئین کی بنیاد یہی ہوگی۔

قائدِ اعظمؒ ان باتوں میں مصروف تھے اور کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ کے اراکین ضروری کاروائی کے لئے مضطرب تھے۔ اس پر میں نے اٹھنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے

میں نہیں کچھ نظائر معلوم ہوں تو مثال کے طور پر مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں جنگ میں حاصل شدہ مال کے متعلق ایک اصولی حکم ہے کہ وہ مال "اللہ اور رسولؐ" کا ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مختلف جنگوں میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کی تقسیم مختلف انداز سے ہوئی ـــــ جنگِ بدر کے خاتمہ پر ایک انداز سے، خیبر کی فتح کے بعد دوسرے انداز سے، جنگِ حنین اور ہوازن میں جو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو آپ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے وہ سارے کا سارا مال اُن مجاہدین میں تقسیم کر دیا جو ابھی کچھ عرصہ سے فتح مکہ کے وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اس پر بعض گوشوں میں کچھ باتیں بھی ہونے لگیں لیکن جب حضورؐ نے اس کی مصلحت سمجھائی تو وہ بیک زبان پکار اُٹھے کہ رضینا یا رسولَ اللہ ـــــ حضورؐ! ہم مطمئن ہیں۔

وہ اِن تفصیلات کو بڑے جذب و انہماک سے سن رہے تھے۔ وہ اس گفتگو کے لئے زیادہ وقت دینا چاہتے تھے لیکن مسلم لیگ کی کارروائی کے اعراد پر انہیں اسے مختصر کرنا پڑا۔ میں اٹھا، تو فرمایا کہ جاتے جاتے ایک اور بنیادی نکتہ بھی ذہن میں لے کر جاؤ۔ کہا کہ میری نظر میں قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق دو بدترین اور ناقابلِ معافی جرم ہیں ـــــ ایک شرک اور دوسرا تفرقہ ـــــ تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر، خواہ سیاسی راہنماؤں کے نام پر ہو، وطنیت کے نام پر ہو، رنگ نسل اور خون کے نام پر ہو، بہرحال جرمِ عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی۔ لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت و خواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی۔ اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں، یاد رکھو! اللہ تعالےٰ نے تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ـــــ ایک مومن اور دوسرے کافر ـــــ اسی کا نام دو قومی نظریہ ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔ اس نکتے کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا۔ جاؤ خدا حافظ۔

میں رخصت ہو کر آیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جسے عام طور پر صرف ایک بیرسٹر سمجھا جاتا ہے اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر کتنی گہری نگاہ ہے۔ اور اس شخص کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی، کتنا بڑا کذب و افترا ہے۔ میں نے حسبِ الارشاد خطبہ تیار کیا اور کلکتہ چلا گیا۔ ہم چار دن وہاں رہے لیکن کیفیت یہ تھی کہ قائدِ اعظمؒ جہاں بھی تھے ہم سے رابطہ قائم کئے رہے اور تفصیلات معلوم کرتے رہے ـــــ آخری اجلاس ختم ہونے سے پہلے ان کی طرف سے تنظیم کے متعلق بھی ضروری ہدایات موصول ہو گئیں اور قرارداد کے سلسلے میں بھی۔

ان قراردادوں میں یہ کہا گیا تھا کہ:-

(۱) تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے جو قرآن مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل

میں نہیں کچھ نظائر معلوم ہوں تو مثال کے طور پر مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں جنگ میں حاصل شدہ مال کے متعلق ایک اصولی حکم ہے کہ وہ مال "اللہ اور رسولؐ" کا ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مختلف جنگوں میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کی تقسیم مختلف انداز سے ہوئی ـــــ جنگِ بدر کے خاتمہ پر ایک انداز سے، خیبر کی فتح کے بعد دوسرے انداز سے، جنگِ حنین اور ہوازن میں جو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو آپ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے وہ سارے کا سارا مال اُن مجاہدین میں تقسیم کر دیا جو ابھی کچھ عرصہ سے فتح مکہ کے وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اس پر بعض گوشوں میں کچھ باتیں بھی ہونے لگیں لیکن جب حضورؐ نے اس کی مصلحت سمجھائی تو وہ بیک زبان پکار اُٹھے کہ رضینا یا رسولَ اللہ ـــــ حضورؐ! ہم مطمئن ہیں۔

وہ اِن تفصیلات کو بڑے جذب و انہماک سے سن رہے تھے۔ وہ اس گفتگو کے لئے زیادہ وقت دینا چاہتے تھے لیکن مسلم لیگ کی کارروائی کے اعداد پر انہیں اسے مختصر کرنا پڑا۔ میں اٹھا، تو فرمایا کہ جاتے جاتے ایک اور بنیادی نکتہ بھی ذہن میں لے کر جاؤ۔ کہا کہ میری نظر میں قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق روئے بدترین اور ناقابلِ معافی جرم ہیں ـــــ ایک شرک اور دوسرا تفرقہ ـــــ تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر، خواہ سیاسی راہنماؤں کے نام پر ہو، وطنیت کے نام پر ہو، رنگ نسل اور خون کے نام پر ہو، بہرحال جرمِ عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی۔ لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت و خواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی۔ اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں، یاد رکھو! اللہ تعالےٰ نے تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ـــــ ایک مومن اور دوسرے کافر ـــــ اسی کا نام دو قومی نظریہ ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔ اس نکتے کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا۔ جاؤ خدا حافظ۔

میں رخصت ہو کر آیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جسے عام طور پر صرف ایک بیرسٹر سمجھا جاتا ہے اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر کتنی گہری نگاہ ہے۔ اور اس شخص کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی، کتنا بڑا کذب و افترا ہے۔ میں نے حسب الارشاد خطبہ تیار کیا اور کلکتہ چلا گیا۔ ہم چار دن وہاں رہے لیکن کیفیت یہ تھی کہ قائدِ اعظمؒ جہاں بھی تھے ہم سے رابطہ قائم کئے رہے اور تفصیلات معلوم کرتے رہے ـــــ آخری اجلاس ختم ہونے سے پہلے ان کی طرف سے تنظیم کے متعلق بھی ضروری ہدایات موصول ہو گئیں اور قرارداد کے سلسلے میں بھی۔

ان قراردادوں میں یہ کہا گیا تھا کہ:-

(۱) تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے جو قرآنِ مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل

اصول ہے۔

(۲) اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبیینؐ کی طرز پر حکومت قائم ہوگی، جس کا نام خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآن حکیم کی حکمرانی ہوگی۔

(۳) اکھنڈ بھارت کی اسکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اُسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ (اور ان کے علاوہ کچھ تنظیمی قرار دادیں) اس مردِ مومن کی ہدایات کے مطابق مرتب اور منظور کی گئیں جسے ایک گوشے سے "کافرِ اعظم" کہہ کر پکارا جاتا تھا اور دوسرے گوشے سے یہ آواز بلند کی جاتی تھی کہ اس کی اسکیم کے مطابق جو مملکت قائم ہوگی اس میں حکومت ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کی سرحدوں کا تحفظ تھا۔ اور جن لوگوں کی آنکھوں پر حسد اور تعصب نے پٹی نہیں باندھ دی، انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ایسا کرنا خود قرآنِ مجید ہی کے ارشاد کی تعمیل میں تھا۔ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ایک سال تک زندہ رہے ـــــ زندہ کہا، یوں کہیئے کہ صرف سانس لیتے رہے اور جس مہلک مرض کا وہ شکار ہو گئے تھے اُسے ایک راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں انہوں نے اندرونِ ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ کیا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نحیف و نزار مریض شخص محض قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ میں مختلف مکتبوں اور دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں سے شرفِ تلمذ اور تعارف حاصل رہا۔ میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی رہنماؤں کو بھی۔ لیکن مجھے پوری زندگی میں قائدِ اعظمؒ سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ میں نے ہر ایک کو اُن سے کمتر پایا ـــــ بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ اِس قسم کے انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے خلاف آج ہذیان بک رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چاند پر تھوکا، خود اپنے منہ پر آیا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، سب مل کر بھی اس بطلِ جلیل کے غبارِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ اُسے اپنے سحابِ کرم کے سائے میں رکھے۔

والسلام

خاکسار۔ غلام مرشد (سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور ۱۹۳۵-۶۶ء)

۴ ۶/۷۶

اصول ہے۔

(۲) اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبیینؐ کی طرز پر حکومت قائم ہو گی، جس کا نام خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآن حکیم کی حکمرانی ہو گی۔

(۳) اکھنڈ بھارت کی اسکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اُسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ (اور ان کے علاوہ کچھ تنظیمی قرار دادیں) اس مردِ مومن کی ہدایات کے مطابق مرتب اور منظور کی گئیں جسے ایک گوشے سے "کافرِ اعظم" کہہ کر پکارا جاتا تھا اور دوسرے گوشے سے یہ آواز بلند کی جاتی تھی کہ اس کی اسکیم کے مطابق جو مملکت قائم ہو گی اس میں حکومت ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہو گی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کی سرحدوں کا تحفظ تھا۔ اور جن لوگوں کی آنکھوں پر حسد اور تعصب نے پٹی نہیں باندھ دی، انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ایسا کرنا خود قرآنِ مجید ہی کے ارشاد کی تعمیل میں تھا۔ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ایک سال تک زندہ رہے ـــــ زندہ کیا، یوں کہیئے کہ صرف سانس لیتے رہے اور جس مہلک مرض کا وہ شکار ہو گئے تھے اُسے ایک راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں انہوں نے اندرونِ ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ کیا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نحیف و نزار مریض شخص محض قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ میں مختلف مکتبوں اور دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں سے شرفِ تلمذ اور تعارف حاصل رہا۔ میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی رہنماؤں کو بھی۔ لیکن مجھے پوری زندگی میں قائدِ اعظمؒ سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ میں نے ہر ایک کو اُن سے کمتر پایا ـــــ بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ اِس قسم کے انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے خلاف آج ہذیان بک رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چاند پر تھوکا، خود اپنے منہ پر آیا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، سب مل کر بھی اس بطلِ جلیل کے غبارِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ اُسے اپنے سحابِ کرم کے سائے میں رکھے۔

والسلام

خاکسار۔ غلام مرشد (سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور ۶۶-۱۹۳۵ء)

۴ ۶/۷۶

قصہ نمائشِ کتب کا :

روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۲۵ر مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ (وزارتِ امورِ مذہبیہ حکومتِ پاکستان) کے سیکرٹری مسٹر شرف الدین کا ایک تفصیلی بیان شائع ہوا۔ جس میں منجملہ دیگر امور یہ کہا گیا کہ :-

> جہاں تک مولانا مودودی کی کتابوں کو نمائش میں شامل نہ کرنے کا تعلق ہے، نمائش کی منتخب کمیٹی کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کسی ایسے مصنف کی کوئی کتاب نمائش میں نہ رکھی جائے جس کی تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی اکثریت نے اُس کے بعض مذہبی نظریات کی وجہ سے مذمت کی ہو۔ اس فیصلے کے مطابق مولانا مودودی اور مسٹر غلام احمد پرویز کی کتابیں مسترد کر دی گئیں اور انہیں قابلِ نمائش نہیں سمجھا گیا۔

اس بیان میں تاثر یہ دیا گیا ہے کہ یہ کتابیں تحقیقی ادارے کو نمائش میں رکھنے کے لئے از خود بھیج دی گئی تھیں اور ان کی منتخب کمیٹی نے انہیں نمائش میں رکھنے کے قابل نہ سمجھا اور مسترد کر دیا۔ اس تاثر کے ماتحت ہمارے احباب نے مختلف گوشوں سے ہم سے پوچھا ہے کہ ہم نے ان کتابوں کو اس ادارے کے پاس از خود کیوں بھیج دیا۔ اندریں حالات، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اصل واقعہ کو طلوعِ اسلام میں بیان کر دیا جائے۔ جہانتک ہماری کتابوں کا تعلق ہے واقعہ حسبِ ذیل ہے:-

گذشتہ دسمبر میں، ہمیں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (وزارتِ امورِ مذہبیہ، حکومتِ پاکستان) کی طرف سے چٹھی نمبری F.P.I(3)IRI-75/6631 مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۷۵ء موصول ہوئی جس میں کہا گیا کہ ادارہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے پندرھویں یومِ تاسیس کے موقع پر اہم اسلامی کتابوں کی ملک گیر نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں کہا گیا کہ ہم اس نمائش میں ضرور حصہ لیں اور اپنی کتابیں بھیجیں۔ اس کے جواب میں ہم نے معذرت چاہی تو ان کی طرف سے جنوری ۱۹۷۶ء میں چٹھی نمبری F.P(57)IRI/8051 مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۷۶ء موصول ہوئی جس میں پھر درخواست کی گئی کہ ہم ضرور اس نمائش میں شرکت کریں۔ ہم نے اپنے پہلے جواب کی روشنی میں اس چٹھی کا کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اس کے بعد اُن کی طرف سے فروری ۱۹۷۶ء میں پھر ایک خط (نمبری F.P.5(57)IRI/21022 مورخہ ۱۹ر فروری ۱۹۷۶ء) ملا جس میں کہا گیا کہ :-

> ہم آپ کو اس امر کی پوری ضمانت دیتے ہیں کہ آپ کی کتابیں (انشاء اللہ) آپ کو صحیح حالت میں واپس ملیں گی۔ اس لئے آپ نمائش میں ضرور شریک ہوں اور

قصہ نمائشِ کتب کا:

روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۲۵ رمئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں؛ ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ (وزارتِ امور مذہبیہ حکومتِ پاکستان) کے سیکرٹری مسٹر شرف الدین کا ایک تفصیلی بیان شائع ہوا۔ جس میں منجملہ دیگر امور یہ کہا گیا کہ :-

> جہاں تک مولانا مودودی کی کتابوں کو نمائش میں شامل نہ کرنے کا تعلق ہے، نمائش کی منتخب کمیٹی کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کسی ایسے مصنف کی کوئی کتاب نمائش میں نہ رکھی جائے جس کی تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی اکثریت نے اُس کے بعض مذہبی نظریات کی وجہ سے مذمت کی ہو۔ اس فیصلے کے مطابق مولانا مودودی اور مسٹر غلام احمد پرویز کی کتابیں مسترد کر دی گئیں اور انہیں قابلِ نمائش نہیں سمجھا گیا۔

اس بیان میں تاثر یہ دیا گیا ہے کہ یہ کتابیں تحقیقی ادارے کو نمائش میں رکھنے کے لئے از خود بھیج دی گئی تھیں اور ان کی منتخب کمیٹی نے انہیں نمائش میں رکھنے کے قابل نہ سمجھا اور مسترد کر دیا۔ اس تاثر کے ماتحت ہمارے احباب نے مختلف گوشوں سے ہم سے پوچھا ہے کہ ہم نے ان کتابوں کو اس ادارے کے پاس از خود کیوں بھیج دیا۔ اندریں حالات، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اصل واقعہ کو طلوعِ اسلام میں بیان کر دیا جائے۔ جہاں تک ہماری کتابوں کا تعلق ہے واقعہ حسبِ ذیل ہے:-

گذشتہ دسمبر میں ہمیں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (وزارتِ امورِ مذہبیہ، حکومتِ پاکستان) کی طرف سے چٹھی نمبری F.P.1(3)IRI-75/6631 مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۷۵ء موصول ہوئی جس میں کہا گیا کہ ادارہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے پندرھویں یومِ تاسیس کے موقع پر اہم اسلامی کتابوں کی ملک گیر نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں کہا گیا کہ ہم اس نمائش میں ضرور حصہ لیں اور اپنی کتابیں بھیجیں۔ اس کے جواب میں ہم نے معذرت چاہی تو ان کی طرف سے جنوری ۱۹۷۶ء میں چٹھی نمبری F.P(57)IRI/8051 مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۷۶ء موصول ہوئی جس میں پھر درخواست کی گئی کہ ہم ضرور اس نمائش میں شرکت کریں۔ ہم نے اپنے پہلے جواب کی روشنی میں اس چٹھی کا کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اس کے بعد اُن کی طرف سے فروری ۱۹۷۶ء میں پھر ایک خط (نمبری F.P.5(57)IRI/21022 مورخہ ۱۹ر فروری ۱۹۷۶ء) ملا جس میں کہا گیا کہ:-

> ہم آپ کو اس امر کی پوری ضمانت دیتے ہیں کہ آپ کی کتابیں (ان شاء اللہ) آپ کو صحیح حالت میں واپس ملیں گی۔ اس لئے آپ نمائش میں ضرور شریک ہوں اور

اپنی کتب کی فہرست موضوع وار ہمیں فوراً بھیج دیں تاکہ انہیں اس ـــــ کتابچہ میں شریک کیا جائے جس کی اس موقعہ پر اشاعت زیرِ غور ہے۔

اُن کے اس قدر اصرار اور اس ضمانت کے بعد ہم نے انکار مناسب نہ سمجھا اور پرویز صاحب کی تئیس کتابیں ان کے پاس بھیج دیں جنہیں انہوں نے شکریے کے ساتھ وصول کیا۔ اس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیا ہوا بجز مسٹر شرف الدین کے اس بیان کے، جس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ انہوں نے آج تک اس باب میں ہمیں کچھ لکھنے کی اخلاقی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اگر وہ ہمیں کچھ لکھتے تو ہم اُن سے صرف اتنا پوچھتے کہ جب وہ ان کتابوں کے لئے ہم سے بار بار درخواست اور اصرار کر رہے تھے تو کیا انہیں ان کے مصنف (پرویز صاحب) کا تعارف حاصل نہیں تھا؟ کیا ان پر کتابیں دیکھوں ہونے کے بعد یہ "وحی" نازل ہوئی کہ اس (مصنف) کے متعلق علماء کے یہ خیالات ہیں۔ اس لئے یہ کتابیں اس قابل نہیں کہ انہیں نمائش میں رکھا جائے؟

اس واقعہ کے پس منظر میں کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم تک مختلف روایات پہنچی ہیں لیکن چونکہ ہم بلا تحقیق روایات پر عمل نہیں کیا کرتے اس لئے ہم اس باب میں کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ بجز اس کے، کہ اگر اس ادارے کا یہ خیال ہے کہ اس شرمناک اقدام سے انہوں نے پرویز صاحب کی کتابوں کو کچھ نقصان پہنچایا ہے تو انہیں اس کا افسوس ہونا چاہیئے کہ وہ اس میں قطعاً کامیاب نہ ہو سکے ہیں نہ کبھی ہو سکیں گے۔ پرویز صاحب کی تصنیفات اِس قسم کے سہاروں کی محتاج ہی نہیں۔ وہ حق کی آواز کی پیامبر ہیں اور حق میں از خود زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت ہوتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نشر و اشاعت کے خارجی ذرائع کے فقدان کے باوجود یہ کتابیں، بفضلِ ایزدی مخالفتوں کی چٹانوں کو چیرتی ہوئی اپنا راستہ آپ بناتی اور آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس، اس ادارہ (ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ) کے متعلق یہ تو لوگوں کو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ علم و تحقیق سے عاری ہے، اب یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ وہ اخلاق و شرافت سے بھی تہی دامن ہے۔ یہ وہ ادارے ہیں جن پر لاکھوں روپیہ صرف کر کے قوم کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ یہ اسلامی تحقیقات کا اہم فریضہ سرانجام دیں گے۔

یاد رکھئے! علمی تحقیق کے لئے دیانت تو لازمی شرط ہوتی ہی ہے، لیکن جب آپ اس کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر دیں گے تو اس میں تقدیس تک کا عنصر بھی شامل ہو جائے گا۔ اور یہ خصوصیات اس ادارہ کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ قارئین طلوعِ اسلام اس سے بخوبی واقف ہیں۔

> اپنی کتب کی فہرست موضوع وار ہمیں فوراً بھیج دیں تاکہ انہیں اس ——— کتابچہ میں شریک کیا جائے جس کی اس موقعہ پر اشاعت زیرِ غور ہے۔

ان کے اس قدر اصرار اور اس ضمانت کے بعد ہم نے انکار مناسب نہ سمجھا اور پرویز صاحب کی تئیس کتابیں ان کے پاس بھیج دیں جنہیں انہوں نے شکریہ کے ساتھ وصول کیا۔ اس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیا ہوا بجز مسٹر شرف الدین کے اس بیان کے، جس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ انہوں نے آج تک اس باب میں ہمیں کچھ لکھنے کی اخلاقی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اگر وہ ہمیں کچھ لکھتے تو ہم ان سے صرف اتنا پوچھتے کہ جب وہ ان کتابوں کے لئے ہم سے بار بار درخواست اور اصرار کر رہے تھے تو کیا انہیں ان کے مصنف (پرویز صاحب) کا تعارف حاصل نہیں تھا؟ کیا ان پر کتابیں وصول ہونے کے بعد یہ "وحی" نازل ہوئی کہ اس (مصنف) کے متعلق علماء کے یہ خیالات ہیں۔ اس لئے یہ کتابیں اس قابل نہیں کہ انہیں نمائش میں رکھا جائے؟

اس واقعہ کے پس منظر میں کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم تک مختلف روایات پہنچی ہیں لیکن چونکہ ہم بلا تحقیق روایات پر عمل نہیں کیا کرتے اس لئے ہم اس باب میں کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ بجز اس کے، کہ اگر اس ادارے کا یہ خیال ہے کہ اس شرمناک اقدام سے انہوں نے پرویز صاحب کی کتابوں کو کچھ نقصان پہنچایا ہے تو انہیں اس کا افسوس ہونا چاہیئے کہ وہ اس میں قطعاً کامیاب نہ ہو سکے ہیں نہ کبھی ہو سکیں گے۔ پرویز صاحب کی تصنیفات اس قسم کے سہاروں کی محتاج ہی نہیں، وہ حق کی آواز کی پیامبر ہیں اور حق میں از خود زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت ہوتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نشر و اشاعت کے خارجی ذرائع کے فقدان کے باوجود یہ ندہاں، بفضلِ ایزدی مخالفتوں کی چٹانوں کو چیرتی ہوئی اپنا راستہ آپ بناتی اور آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس، اس ادارہ (ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ) کے متعلق یہ تو لوگوں کو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ علم و تحقیق سے عاری ہے، اب یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ وہ اخلاق و شرافت سے بھی تہی دامن ہے۔ یہ وہ ادارے ہیں جن پر لاکھوں روپیہ صرف کر کے قوم کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ یہ اسلامی تحقیقات کا اہم فریضہ سرانجام دیں گے۔

یاد رکھئے! علمی تحقیق کے لئے دیانت تو لازمی شرط ہوتی ہی ہے، لیکن جب آپ اس کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر دیں گے تو اس میں تقدیس تک کا عنصر بھی شامل ہو جائے گا۔ اور یہ خصوصیات اس ادارہ کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ قارئین طلوع اسلام اس سے بخوبی واقف ہیں۔

نقد و نظر

※۔۔۔ نام کتاب : پاکستان۔ ماضیہا وحاضرہا۔
※۔۔۔ ضخامت : بڑی تقطیع کے ۳۹۲ صفحات۔
※۔۔۔ مصنف : ڈاکٹر ناصرالدین احسان سامی حنفی۔
※۔۔۔ شائع کردہ : دارالنفائس۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۳۴۷ بیروت۔

یہ عربی کتاب پاکستان، اس کے ماضی اور زمانہ حال کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام پر ایک چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی عربی زبان میں اس پر کوئی معیاری کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عرب بھائی قیام پاکستان کے بارے میں صحیح حالات سے زیادہ تر بے خبر تھے۔ بھارت نے اس صورتِ حالات کا بڑی چالاکی سے فائدہ اٹھایا اور پھر اپنے شاطرانہ پراپیگنڈے کے ذریعے ہمیں اپنے بھائیوں سے دور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سقوطِ ڈھاکہ جہاں ہمارے لئے ایک قومی المیے کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں اس کے کچھ ایسے نتائج بھی نکلے جو ہمارے لئے کسی حد تک مفید ثابت ہوئے۔ مثلاً ان میں سے ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے عرب بھائیوں نے ہندو ذہن کی اصلی جھلک دیکھ لی۔ کئی اہلِ علم عرب حضرات برسوں تک برصغیر ہندو پاک میں رہے اور یہاں کے حالات کا مطالعہ اپنی آنکھوں سے کرتے رہے، لیکن انہوں نے کبھی اس کا احساس تک بھی نہ کیا کہ انہیں ہندو کے عیارانہ پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی ہمارے سفارتی نمائندوں میں سے کوئی ایسی شخصیت سامنے آئی کہ ایسے اہلِ علم کو تلاش کر کے ان کا تعاون حاصل کیا جاتا لیکن بنگلہ دیش کے قیام کے سلسلے میں ہندوستان نے جو کارروائیاں کیں تو اس سے ان حضرات کو دھچکا سا لگا اور ان کے قلم حرکت میں آ گئے۔ انہیں میں سے ایک اہم شخصیت ڈاکٹر ناصرالدین احسان سامی حنفی کی ہے۔ جو قیام پاکستان سے بھی بہت پہلے آٹھ سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ کتاب زیرِ تبصرہ انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ برصغیر کے قیام کے دوران انہیں یہ مواقع حاصل تھے کہ وہ یہاں کا تفصیلی دورہ کر سکیں، تاہم کتاب کی تیاری سے پہلے انہوں نے ایک دفعہ پھر اس علاقے کا تفصیلی دورہ کیا۔ اور پیرانہ سالی کے باوجود (اس وقت ان کی عمر کوئی پچھتر سال ہے) انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب جیسی کاوش اور

نقد و نظر

- نام کتاب : پاکستان ۔ ماضیہا وحاضرہا ۔
- ضخامت : بڑی تقطیع کے ۲۹۴ صفحات ۔
- مصنف : ڈاکٹر ناصرالدین احسان سامی حنفی ۔
- شائع کردہ : دار النفائس ۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۳۴۷ بیروت ۔

یہ عربی کتاب پاکستان ، اس کے ماضی اور زمانہ حال کے حالات پر مشتمل ہے ۔ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام پر ایک چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی عربی زبان میں اس پر کوئی معیاری کتاب نہیں لکھی گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عرب بھائی قیام پاکستان کے بارے میں صحیح حالات سے زیادہ تر بے خبر تھے ۔ بھارت نے اس صورتِ حالات کا بڑی چالاکی سے فائدہ اٹھایا اور پھر اپنے شاطرانہ پراپیگنڈے کے ذریعے ہمیں اپنے بھائیوں سے دور کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔

سقوطِ ڈھاکہ جہاں ہمارے لئے ایک قومی المیے کی حیثیت رکھتا ہے ، وہاں اس کے کچھ ایسے نتائج بھی نکلے جو ہمارے لئے کسی حد تک مفید ثابت ہوئے ۔ مثلاً ان میں سے ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے عرب بھائیوں نے ہندو ذہن کی اصلی جھلک دیکھ لی ۔ کئی اہلِ علم عرب حضرات برسوں تک برصغیر ہندو پاک میں رہے اور یہاں کے حالات کا مطالعہ اپنی آنکھوں سے کرتے رہے ، لیکن انہوں نے کبھی اس کا احساس تک بھی نہ کیا کہ انہیں ہندو کے عیارانہ پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرنا چاہیئے ۔ اور نہ ہی ہمارے سفارتی نمائندوں میں سے کوئی ایسی شخصیت سامنے آئی کہ ایسے اہلِ علم کو تلاش کر کے ان کا تعاون حاصل کیا جاتا لیکن بنگلہ دیش کے قیام کے سلسلے میں ہندوستان نے جو کارروائیاں کیں تو اس سے ان حضرات کو دھچکا سا لگا اور ان کے قلم حرکت میں آ گئے ۔ انہیں میں سے ایک اہم شخصیت ڈاکٹر ناصرالدین احسان سامی حنفی کی ہے ۔ جو قیام پاکستان سے بھی بہت پہلے آٹھ سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے تھے ۔ کتاب زیرِ تبصرہ انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ برصغیر کے قیام کے دوران انہیں یہ مواقع حاصل تھے کہ وہ یہاں کا تفصیلی دورہ کر سکیں ۔ تاہم کتاب کی تیاری سے پہلے انہوں نے ایک دفعہ پھر اس علاقے کا تفصیلی دورہ کیا ۔ اور پیرانہ سالی کے باوجود (اس وقت ان کی عمر کوئی پچھتر سال ہے) انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب ایسی کاوش اور

محنت سے تیار کی ہے کہ خود ہماری اپنی قومی زبان اُردو یا انگریزی میں ایسی معیاری کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔

قیام پاکستان کی تحریک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ہندو کیا ہے؟ اس کے بغیر اس تحریک کے صحیح معنوں میں سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ آج ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں قیام پاکستان کے بارے میں جو شک و شبہات ابھرتے رہتے ہیں تو اس کی بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں نہ تو ہندو ذہنیت کا کوئی عملی تجربہ ہے اور نہ ہی ان لوگوں نے جنہیں اس بارے میں کوئی عملی تجربہ تھا، ان کی رہنمائی کی۔ جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے پرویز صاحب وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اس کی طرف توجہ دی اور ایک نہایت بلند پایہ علمی تحقیقاتی مقالہ "ہندو کیا ہے؟" تحریر فرمایا۔ جس کی مخالفین تک نے تعریف کی۔ ڈاکٹر سائی حقی کا اس بارے میں مطالعہ بھی علمی بنیادوں پر ہے۔ اور ہندوستان میں قیام کے دوران انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہندو مت کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا بلکہ ان کی مذہبی کتابوں، مثلاً منوسمرتی وغیرہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب زیر تبصرہ میں انہوں نے اس علمی انداز سے ہندو ذہن کی عکاسی کی ہے کہ پاکستان کی اہمیت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ ایک کشادہ نظر مؤرخ کی طرح فاضل مصنف نے ہندو مت کے اچھے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن چونکہ ہندو ذہنیت نفرت اور انسان دشمنی سے ترتیب پاتی ہے۔ اس لئے وہ ان چند خوبیوں کو بھی گہنا دیتی ہے۔ مثلاً ہندو انسانوں کے مقابلے میں جانوروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گائے کی پرستش بھی کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے، اور ہندو پروپیگنڈہ برابر یہ تاثر قائم کر رہتا ہے کہ یہ بڑے بے ضرر اور رحم دل لوگ ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جو ایک گائے کے خون کے بدلے سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ پھر مصنف اپنے قیام ہند کے دوران کے چند ذاتی واقعات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح محض یہ افواہ اڑانے پر کہ فلاں گاؤں میں مسلمانوں نے ایک گائے ذبح کر دی ہے، درجنوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ لگاتار جاری رہتا۔ (صفحہ ۱۱۹)

ہندو ذہنیت کو اجاگر کرنے کے بعد فاضل مصنف اپنے عرب بھائیوں کو بڑے علمی دلائل سے یہ سمجھاتے ہیں کہ ہندو مت اور موجودہ یہودیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ منوسمرتی کے بہت سے اقتباسات کا موازنہ بائبل کے عہدنامہ قدیم کی عبارتوں سے کرتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ایک مذہب کی تعلیمات و اصلاحات بگڑ کر دوسرے مذہب میں کیا سے کیا بن گئیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق تو ہندوؤں کے معبودوں یعنی "رام" اور "برہما" کے الفاظ بھی (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ (صفحہ ۱۳۴) اس کی تائید میں وہ لکھتے ہیں کہ مختلف اقوام میں ایک ہی مشہور لفظ کا بگڑی ہوئی شکلیں اختیار کر لینا کوئی نئی بات نہیں۔ دور کیوں جایئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے اسم گرامی (محمدؐ) کو لیجئے کہ اشتراک عقیدت کے باوجود مختلف ممالک میں اس کے تلفظ

محنت سے تیار کی ہے کہ خود ہماری اپنی قومی زبان اُردو یا انگریزی میں ایسی معیاری کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔

قیام پاکستان کی تحریک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ہندو کیا ہے؟ اس کے بغیر اس تحریک کے صحیح معنوں میں سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ آج ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں قیام پاکستان کے بارے میں جو شک و شبہات ابھرتے رہتے ہیں تو اس کی بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں نہ تو ہندو ذہنیت کا کوئی عملی تجربہ ہے اور نہ ہی ان لوگوں نے جنہیں اس بارے میں کوئی عملی تجربہ تھا ان کی رہنمائی کی۔ جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے پرویز صاحب وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اس کی طرف توجہ دی اور ایک نہایت بنیادی علمی تحقیقاتی مقالہ "ہندو کیا ہے؟" تحریر فرمایا۔ جس کی مخالفین تک نے تعریف کی۔ ڈاکٹر ساہی حقی کا اس بارے میں مطالعہ بھی علمی بنیادوں پر ہے۔ اور ہندوستان میں قیام کے دوران انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہندو مت کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا بلکہ ان کی مذہبی کتابوں، مثلاً منوسمرتی وغیرہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب زیر تبصرہ میں انہوں نے اس علمی انداز سے ہندو ذہن کی عکاسی کی ہے کہ پاکستان کی اہمیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ایک کشادہ نظر مؤرخ کی طرح فاضل مصنف نے ہندو مت کے اچھے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن چونکہ ہندو ذہنیت نفرت اور انسان دشمنی سے ترتیب پاتی ہے۔ اس لئے وہ اِن چند خوبیوں کو بھی گہنا دیتی ہے۔ مثلاً ہندو انسانوں کے مقابلے میں جانوروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گائے کی پرستش بھی کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے، اور ہندو پروپیگنڈہ برابر یہ تاثر قائم کر رہتا ہے کہ یہ بڑے بے ضرر اور رحم دل لوگ ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جو ایک گائے کے خون کے بدلے سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ پھر مصنف اپنے قیام ہند کے دوران کے چند ذاتی واقعات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح محض یہ افواہ اڑانے پر کہ فلاں گاؤں میں مسلمانوں نے ایک گائے ذبح کر دی ہے، درجنوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ لگاتار جاری رہتا۔ (صفحہ ۱۱۹)

ہندو ذہنیت کو اجاگر کرنے کے بعد فاضل مصنف اپنے عرب بھائیوں کو بڑے علمی دلائل سے یہ سمجھاتے ہیں کہ ہندو مت اور موجودہ یہودیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ منوسمرتی کے بہت سے اقتباسات کا موازنہ بائبل کے عہد نامہ قدیم کی عبارتوں سے کرتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ایک مذہب کی تعلیمات و اصلاحات بگڑ کر دوسرے مذہب میں کیا سے کیا بن گئیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق تو ہندوؤں کے معبودوں یعنی "رام" اور "برہما" کے الفاظ بھی (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ (صفحہ ۱۳۴) اس کی تائید میں وہ لکھتے ہیں کہ مختلف اقوام میں ایک ہی مشہور لفظ کا بگڑی ہوئی شکلیں اختیار کر لینا کوئی نئی بات نہیں۔ دور کیوں جایئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے اسم گرامی (محمدؐ) کو لیجئے کہ اشتراک عقیدت کے باوجود مختلف ممالک میں اس کے تلفظ

مختلف ہیں۔ مثلاً بعض ممالک میں اسے ماشوئی لکھا جاتا ہے اور افریقہ کی اکثر اقوام اس کا تلفظ ماماوہ کرتے ہیں۔ (ص۱۳۶)

تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہندوؤں نے جس قدر شور مچایا تھا اور کچھ عرصے بعد اس انتظامی فیصلے کو بدلوا کر ہی دم لیا تھا مصنف اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ ہندو کے اس طرزِ عمل نے عقل و خرد رکھنے والے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ قوم کبھی مسلمانوں کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی خطرہ کے پیشِ نظر مسلمانانِ ہند نے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی جس کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آگیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسلم لیگ کی کوششوں کی مرحلہ وار تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ قائداعظمؒ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ہندوؤں کے لئے پاکستان کو تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہ رہا۔ وہ وقتی طور پر تو اس کے قیام کے بارے میں راضی ہو گئے، لیکن انہیں یقین تھا کہ کچھ عرصے بعد یہ اسلامی ملک خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے اس کے ختم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں نے پاکستان ختم کرنے کے بارے میں جو بیانات دیئے تھے مصنف نے بڑی محنت سے مختلف مقامات سے انہیں اکٹھا کر کے یکجا کر دیا ہے۔ (ص۲۱۱) جن سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے پاکستان پر تین جنگیں کیوں ٹھونسیں۔ مشرقی پاکستان پر حملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس سلسلے میں وہ شیخ مجیب کو تو ایک معمولی سا مہرہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے جھوٹے پروپیگنڈے کے اعداد و شمار کو، جو حسنین ہیکل کی وساطت سے عرب پریس میں شائع ہوتے تھے، ایسے علمی انداز سے رد کرتے ہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی ایسا نہیں کیا گیا۔ (ص۲۷۳)

المیہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں ایک اور تلخ حقیقت کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ یہ صرف ہندو ذہن ہی کا کارنامہ نہیں تھا بلکہ ساری اسلام دشمن قوتیں اس میں شریک تھیں۔ مسلمانوں کا تو سب سے بڑا جرم ہی یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کے دشمن ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو انہیں ختم کر دیا جائے۔ (ص۲۷۱)

چنانچہ فاضل مصنف عربوں کی توجہ اس طرف دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ معاملہ یہیں پر نہیں رک جائے گا۔ بلکہ پاکستان جو اسلام کا قلعہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے کوئی نقصان پہنچا تو پھر عرب بھائی بھی ہندوستان کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے، کیونکہ ہندوستان کی نظریں عربوں کے تیل پر ہیں۔ اس مخالفت میں وہ عربوں کے لئے ہندو کو اسرائیل سے بھی زیادہ خطرناک ثابت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی پاکستان سے مخاصمت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں اس کی راہ کا کانٹا بنا ہوا ہے۔

بنگلہ دیش کے بارے میں ان کا نتیجۂ فکر کتنا مبنی بر حقیقت ہے کہ اگرچہ ہندوستان نے اپنی بدنیتی کی وجہ سے یہ سب کچھ پاکستان کو خصوصاً اور عالمِ اسلام کو عموماً نقصان پہنچانے کے لئے کیا

مختلف ہیں۔ مثلاً بعض ممالک میں اسے <u>ماھوٹی</u> لکھا جاتا ہے اور افریقہ کی اکثر اقوام اس کا تلفظ <u>ماماداو</u> کرتے ہیں۔ (ص۱۳۶)

تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہندوؤں نے جس قدر شور مچایا تھا اور کچھ عرصے بعد اس انتظامی فیصلے کو بدلوا کر ہی دم لیا تھا مصنف اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ ہندو کے اس طرز عمل نے عقل و خرد رکھنے والے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ قوم کبھی مسلمانوں کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی خطرہ کے پیش نظر مسلمانانِ ہند نے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی جس کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آگیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسلم لیگ کی کوششوں کی مرحلہ وار تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ قائداعظمؒ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ہندوؤں کے لئے پاکستان کو تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہ رہا۔ وہ وقتی طور پر تو اس کے قیام کے بارے میں راضی ہو گئے، لیکن انہیں یقین تھا کہ کچھ عرصے بعد یہ اسلامی ملک خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے اس کے ختم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں نے پاکستان ختم کرنے کے بارے میں جو بیانات دیئے تھے مصنف نے بڑی محنت سے مختلف مقامات سے انہیں اکٹھا کرکے یکجا کر دیا ہے۔ (ص۲۱۱) جن سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے پاکستان پر تین جنگیں کیوں ٹھونسیں۔ مشرقی پاکستان پر حملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس سلسلے میں وہ شیخ مجیب کو تو ایک معمولی سا مُہرہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے جھوٹے پروپیگنڈے کے اعداد و شمار کو، جو حسنین ہیکل کی وساطت سے عرب پریس میں شائع ہوتے تھے، ایسے علمی انداز سے رد کرتے ہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی ایسا نہیں کیا گیا۔ (ص۲۷۳)

المیہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں ایک اور تلخ حقیقت کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ یہ صرف ہندو ذہن ہی کا کارنامہ نہیں تھا بلکہ ساری اسلام دشمن قوتیں اس میں شریک تھیں۔ مسلمانوں کا تو سب سے بڑا جرم ہی یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کے دشمن ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو انہیں ختم کر دیا جائے۔ (ص۲۷۷)

چنانچہ فاضل مصنف عربوں کی توجہ اس طرف دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ معاملہ یہیں پر نہیں رک جائے گا، بلکہ پاکستان جو اسلام کا قلعہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے کوئی نقصان پہنچا تو پھر عرب بھائی بھی ہندوستان کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے، کیونکہ ہندوستان کی نظریں عربوں کے تیل پر ہیں۔ اس مخالفت میں وہ عربوں کے لئے ہندو کو اسرائیل سے بھی زیادہ خطرناک ثابت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی پاکستان سے مخاصمت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں اس کی راہ کا کانٹا بنا ہوا ہے۔

بنگلہ دیش کے بارے میں ان کا نتیجہ فکر کتنا مبنی بر حقیقت ہے کہ اگرچہ ہندوستان نے اپنی بدنیتی کی وجہ سے یہ سب کچھ پاکستان کو خصوصاً اور عالم اسلام کو عموماً نقصان پہنچانے کے لئے کیا

ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا کہ ہمارے بنگالی بھائیوں کا جذبۂ اسلام دوبارہ غالب آجائے گا۔ ان کے لیڈروں کی آنکھوں سے تعصب کے پردے ہٹ جائیں گے اور انشاءاللہ تعالیٰ بنگلہ دیش ایک اسلامی طاقت بن کر ابھرے گا جو ہندوستان کے تمام خوابوں کو پریشان کرکے رکھ دے گا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش اکٹھے رہتے تو بلاشبہ یہ اسلام کی ایک بہت بڑی طاقت ہوتے، اور اس کا امکان موجود ہے، لیکن علیحدہ علیحدہ بھی یہ دو بڑی بڑی اسلامی مملکتیں ہوں گی۔ اور اگر یہاں کے لوگوں نے محنت سے کام کیا اور خلوص سے اسلام کو اپنایا تو یہ مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کی طاقت میں اضافہ کا موجب بنیں گی۔ (صفحہ ۳۷) ایسا کچھ انہوں نے محض خوش فہمی کی بنا پر نہیں لکھا۔ علمی شواہد اور حقائق کی بناء پر کہا ہے۔

کتاب کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ اس میں تمام عربی تحریروں کی طرح تکرار نہیں اور عربی سے معمول سُدبُد رکھنے والا بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب بڑی معیاری ہے، اور عرب ممالک میں اس کی جتنی زیادہ اشاعت کی جا سکے وہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ساری اُمّت کے لئے مجموعی طور پر مفید ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وہ ابواب جن میں ہندومت اور ہندو ذہنیت کو واضح کیا گیا ہے مثلاً مَنْ ھم الھنادکۃ، ماھی الھندوکیۃ، الھندوکیۃ والیھودیۃ اور العداء الھندوکی للمسلمین کو علیحدہ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کرکے ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں اسے بڑی آسانی سے ایم اے عربی کے نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا، کیونکہ ابھی تک خود ہماری اپنی زبان میں بھی اس جیسی معیاری کتاب سامنے نہیں آئی۔

(رفیع اللہ شہاب)

اعلان برائے پیشگی کھاتہ داران

مقامِ حدیث کا تازہ ایڈیشن (۱۹۷۶ء) چھپ چکا ہے۔ جس کا اعلان گذشتہ اور حالیہ شمارے میں مسلسل آرہا ہے۔ پیشگی کھاتہ داران کو یہ کتاب حسبِ معمول ارسال کی جائے گی۔ جن کھاتہ داران کو اس کتاب کی ضرورت نہ ہو براہِ کرم ۲۰ جولائی ۱۹۷۶ء تک ادارہ ہذا کو اپنے فیصلے سے مطلع فرما دیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا کہ ہمارے بنگالی بھائیوں کا جذبۂ اسلام دوبارہ غالب آجائے گا۔ ان کے لیڈروں کی آنکھوں سے تعصب کے پردے ہٹ جائیں گے اور ان شاء اللہ تعالیٰ بنگلہ دیش ایک اسلامی طاقت بن کر ابھرے گا جو ہندوستان کے تمام خوابوں کو پریشان کر کے رکھ دے گا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش اکٹھے رہتے تو بلاشبہ یہ اسلام کی ایک بہت بڑی طاقت ہوتے، اور اس کا امکان موجود ہے، لیکن علیحدہ علیحدہ بھی یہ دو بڑی بڑی اسلامی مملکتیں ہوں گی۔ اور اگر یہاں کے لوگوں نے محنت سے کام کیا اور خلوص سے اسلام کو اپنایا تو یہ مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کی طاقت میں اضافہ کا موجب بنیں گی۔ (صفحہ ۲۳۷) ایسا کچھ انہوں نے محض خوش فہمی کی بنا پر نہیں لکھا۔ علمی شواہد اور حقائق کی بنا پر کہا ہے۔

کتاب کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ اس میں تمام عربی تحریروں کی طرح تکرار نہیں اور عربی سے معمولی شُدبُد رکھنے والا بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب بڑی معیاری ہے، اور عرب ممالک میں اس کی جتنی زیادہ اشاعت کی جا سکے وہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ساری اُمت کے لئے مجموعی طور پر مفید ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وہ ابواب جن میں ہندو مت اور ہندو ذہنیت کو واضح کیا گیا ہے مثلاً <u>مَنْ هم الهنادكة</u>، <u>ماهي الهندوكية</u>، <u>الهندوكية والصهيونية</u> اور <u>العداء الهندوكي للمسلمين</u> کو علیحدہ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کر کے ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں اسے بڑی آسانی سے ایم اے عربی کے نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا، کیونکہ ابھی تک خود ہماری اپنی زبان میں بھی اس جیسی معیاری کتاب سامنے نہیں آئی۔

(رفیع اللہ شہاب)

اعلان برائے پیشگی کھاتہ داران

مقامِ حدیث کا تازہ ایڈیشن (۱۹۷۶ء) چھپ چکا ہے۔ جس کا اعلان گذشتہ اور حالیہ شمارے میں مسلسل آ رہا ہے۔ پیشگی کھاتہ داران کو یہ کتاب حسبِ معمول ارسال کی جائے گی۔ جن کھاتہ داران کو اس کتاب کی ضرورت نہ ہو براہِ کرم ۲۰ر جولائی ۱۹۷۶ء تک ادارہ ہذا کو اپنے فیصلے سے مطلع فرما دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

مقامِ حدیث

کا تازہ ایڈیشن بہت سی ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ، شائع ہو چکا ہے۔

یہ وہ کتاب ہے :—

- جس میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ دین کے نظام میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔
- جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مخالفینِ اسلام نے کس طرح ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایسی وضعی روایات داخل کر دیں جن سے اسلام مسخ، اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کا کردار داغدار ہو کر سامنے آئے۔
- جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا ہے جس کی رُو سے کوشش کی گئی کہ قرآنِ کریم پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔
- جس میں مثال کے طور پر، ان "احادیث" کو پیش کیا گیا ہے جن کی نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن جن کے متعلق آپ ایک نگاہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔
- اس میں بتایا گیا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعے کس طرح مرتب کئے گئے اور اور ان کے مرتب کرنے والے کون تھے؟
- اس کتاب کا مطالعہ، آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ کرے گا اور آپ کو بے شمار کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دے گا۔
- اور اس کتاب سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث مشہور کرنا، کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

کتاب، عمدہ بکس بورڈ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت -/۱۰ روپے

ملنے کا پتہ { (۱) ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور
(۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

مقامِ حدیث

کا تازہ ایڈیشن بہت سی ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ، شائع ہو چکا ہے۔

یہ وہ کتاب ہے :—

- جس میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ دین کے نظام میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔
- جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مخالفینِ اسلام نے کس طرح ہمارے احادیث کے مجموعوں میں، ایسی وضعی روایات داخل کر دیں جن سے اسلام مسخ، اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کا کردار داغدار ہو کر سامنے آئے۔
- جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا ہے جس کی رُو سے کوشش کی گئی کہ قرآنِ کریم پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔
- جس میں مثال کے طور پر، ان "احادیث" کو پیش کیا گیا ہے جن کی نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن جن کے متعلق آپ ایک نگاہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔
- اس میں بتایا گیا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعے کس طرح مرتب کئے گئے اور اور ان کے مرتب کرنے والے کون تھے؟
- اس کتاب کا مطالعہ، آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ کرے گا اور آپ کو بے شمار کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دے گا۔
- اور اس کتاب سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث مشہور کرنا، کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

کتاب، عمدہ بکس بورڈ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت -/۱۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور میں ہر اتوار ۸ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)	**لائل پور** ہر جمعہ ۸ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) ۴۵ کوتوالی روڈ حیات سرجری کلینک (فون ۲۴۹۴)
ملتان ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۷۱-۷۲)	**کراچی** ہر اتوار ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوعِ اسلام - دار الفائد ۲۰-۱/بی ناظم آباد ۳ (فون ۶۱۰۴۶۸)
گجرات ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام - بمقام ۱۲/۱/۱ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** ہر جمعہ - ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you., and be not divided among youreelves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/22

محترم پرویز صاحب کا درس قرآنِ کریم

لاہور میں ہر اتوار ۸ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)	**لائل پور** ہر جمعہ ۸½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) ۶۵ کوتوالی روڈ (فون ۲۴۹۴) حیات سرجری کلینک
ملتان ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۷۱-۷۲)	**کراچی** ہر اتوار ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوع اسلام - دارالقائد (فون ۶۱۰۴۶۸) ۲۰-۱/بی ناظم آباد ۳
گجرات ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام - بمقام ۱۲/۱/۱ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** ہر جمعہ - ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you., and be not divided among youreelves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 3/22

بزمِ مذاکرہ

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء)

(قسط دوم)

بزمِ مذاکرہ کی تقاریر کی قسط اول، طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری قسط اب پیشِ خدمت قارئین ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے بزمِ مذاکرہ بالعموم طلبا اور طالبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ شرکاء کا تعارف قسط اوّل میں کرایا جا چکا ہے۔

۶۔ نگہتِ سلطانہ

محترم باجی ..... اور معزز سامعین!

یوں تو زندگی گذارنے کو گذر ہی جاتی ہے مگر جب یہ حسین واقعات اور اتفاقات سے عبارت ہو تو قلبی خوشی کا باعث بنتی ہے اور زندگی، زندگی محسوس ہوتی ہے۔ آپ اس کو حسنِ اتفاق کہہ لیجئے لیکن یہ میرے لئے نہایت باعثِ شرف ہے کہ مجھے طلوعِ اسلام کی اس مقدس محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ اور جب موضوعِ گفتگو بھی ایسا خیال افروز ہو تو نگاہیں دنیائے علم کی لاتعداد وسعتوں میں کھو جاتی ہیں۔ آج کا موضوعِ مذاکرہ علامہ اقبالؒ کا یہ بصیرت افروز شعر ہے ؎

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

شاعرِ مشرق نے اپنے کلامِ بلاغت نظام میں جس ابدی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی ایک جھلک اربابِ عقل و دانش کے لئے جنتِ نگاہ سے کم نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے۔ آج سے صدیوں پہلے شبانہ روز محنت اور کاوش کے سہارے تاریخ کا درخشاں باب قوم کے ہر دلعزیز بہادروں کیلئے چشم براہ ہے۔ پیہم کوششوں اور لگاتار کاوشوں کے نتائج جاوداں ثابت ہوئے ہیں۔ زندگی کی غلب علم کے بغیر اندھی ہے۔ علم کی آبرو دستِ عمل میں اور عمل کی عنان اور باگ ڈور خلوص کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا شعر ارتقائی منازل کی تکمیل کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ اقبالؒ ایسی کوشش: ایسی

بزمِ مذاکرہ

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء)

(قسط دوم)

بزمِ مذاکرہ کی تقاریر کی قسط اول، طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری قسط اب پیشِ خدمت قارئین ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے بزمِ مذاکرہ بالعموم طلبا اور طالبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ شرکاء کا تعارف قسط اوّل میں کرایا جا چکا ہے۔

۶۔ نگہتِ سلطانہ

محترم باباجی ..... اور معزز سامعین!

یوں تو زندگی گذارنے کو گذر ہی جاتی ہے مگر جب یہ حسین واقعات اور اتفاقات سے عبارت ہو تو قلبی خوشی کا باعث بنتی ہے اور زندگی، زندگی محسوس ہوتی ہے۔ آپ اس کو حسنِ اتفاق کہہ لیجئے لیکن یہ میرے لئے نہایت باعثِ شرف ہے کہ مجھے طلوعِ اسلام کی اس مقدس محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ اور جب موضوعِ گفتگو بھی ایسا خیال افروز ہو تو نگاہیں دنیائے علم کی لاتعداد وسعتوں میں کھو جاتی ہیں۔ آج کا موضوعِ مذاکرہ علامہ اقبالؒ کا یہ بصیرت افروز شعر ہے ؎

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

شاعرِ مشرق نے اپنے کلامِ بلاغت نظام میں جس ابدی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی ایک جھلک اربابِ عقل و دانش کے لئے جنتِ نگاہ سے کم نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے۔ آج سے صدیوں پہلے شبانہ روز محنت اور کاوش کے سہارے تاریخ کا درخشاں باب رقم کرنے والے بہادروں کیلئے چشم براہ ہے۔ پیہم کوششوں اور لگاتار کاوشوں کے نتائج جاوداں ثابت ہوئے ہیں۔ زندگی کی طلب علم کے بغیر اندھی ہے۔ علم کی آبرو دستِ عمل میں اور عمل کی عنان اور باگ ڈور خلوص کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا شعر اتقائی منازل کی تکمیل کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ اقبالؒ ایسی کوشش: ایسی

جدوجہد اور ایسا عملِ پیہم چاہتے تھے جو انسان کو تقدیر اور زمانے سے شکست ماننا نہ سکھائے بلکہ ایسی حکمتِ عملی اختیار کرے کہ تدبیر کی ٹکر سے تقدیر مسکرا اُٹھے۔ تقدیر خود قدموں میں جھک آئے۔ یہ سب زمانے سے مسلسل جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اپنے آپ کو تقدیر کے تابع کرنا غلامانہ فطرت کا تقاضا ہے۔ آزادانہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے حالات خود تخلیق کرے۔ زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنا سیکھے۔ اس شتر مرغ کی طرح نہیں جو شکاری کو دیکھ ریت میں منہ چھپا لیتا ہے ؎

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گوہر نکلے

آپ مسلمانوں کو نہ تو ظالمانہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں اور نہ ہی بزدلانہ اندازِ حیات کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مسلمان میدانِ کارزار میں ہو تو وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند دہاڑتا ہے اور جب وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھتا ہے تو ایک بلبلِ خوش نوا کی طرح چہکتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ہر آنے والی رکاوٹ اور مشکل انسان کی ترقی اور عروج کا پیش خیمہ ہے۔ منزل کا نہ ملنا مزید آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے۔ دشمن کا وجود انسان کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ کیونکہ وہ عمل پہ اکساتا ہے۔

محترم باباجی! ..... عورتوں کا بھی جہادِ انسانیت میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مردوں کا ۔ مگر مجھے بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم جب بھی خلوص، قربانی، ایثار اور ہمت کی شمشیریں لے کر اُٹھتی ہیں زندگی کے ہر مقام پہ ہماری راہیں روکی جاتی ہیں۔ طرح طرح سے حوصلے پست کئے جاتے ہیں۔ ہماری ہمت، خلوص کو بناوٹ، دکھاوے سے تعبیر کر کے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا کب تک عورت کی عظمت اور قربانیوں سے انکار کرتی رہے گی ..... ؟ کیا یہ اُن عظیم ماؤں کو بھول سکتے ہیں جنہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صرف اس امید پر پروان چڑھایا کہ وہ اپنی زندگیاں خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ تاریخ کے اوراق کیوں اب تک طارق بن زیاد۔ خالد بن ولید اور محمد بن قاسم جیسے مجاہدوں کی بہادری کی گواہی دیتے ہیں؟ اگر اس زمانے کی مثال لیتے ہیں تو کون جھٹلا سکتا ہے اُن جرأت کے نشانوں کو، جن کی بہادری اور قربانیوں کی گواہی اب تک وہ زمین دیتی ہے جہاں ان کے مقدس خون بہے تھے۔ کیا اِن عظیم اور جہاد کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والے شہیدوں اور مجاہدوں کی ماؤں کا کوئی درجہ نہیں ..... ؟ ایک عورت کا جہاد اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اس کی تربیت دیئے ہوئے بچے دوسروں کے لئے عملی زندگی میں مشعلِ راہ بنیں۔

معزز سامعین! آج میں یہ بڑے دکھ سے پوچھتی ہوں کہ کہاں چلی گئی وہ محبت جس کو "فاتحِ عالم" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس نے ایک مردِ مومن کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف ایک بہن کی پکار پہ مملکتِ ہند کا نقشہ الٹ کر رکھ دے۔ کہاں ہیں اب وہ شمشیریں، جن کی چمک دمک سے سندھ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا پہ اسلام کے پرچم بلند ہو گئے۔

محترم باباجی! ..... آج جب ہمیں ایسی محبت جو قوم کو سدھار دے، جو دشمن کو اپنا بنا لے، نظر

جدوجہد اور ایسا عملِ پیہم چاہتے تھے جو انسان کو تقدیر اور زمانے سے شکست ماننا نہ سکھائے بلکہ ایسی حکمتِ عملی اختیار کرے کہ تدبیر کی ٹکر سے تقدیر مسکرا اُٹھے۔ تقدیر خود قدموں میں جھک آئے۔ یہ سب زمانے سے مسلسل جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اپنے آپ کو تقدیر کے تابع کرنا غلامانہ فطرت کا تقاضا ہے۔ آزادانہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے حالات خود تخلیق کرے۔ زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنا سیکھے۔ اس شترمرغ کی طرح نہیں جو شکاری کو دیکھ ریت میں منہ چھپا لیتا ہے ؎

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گوہر نکلے

آپ مسلمانوں کو نہ تو ظالمانہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں اور نہ ہی بزدلانہ اندازِ حیات کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مسلمان میدانِ کارزار میں ہو تو وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند دہاڑتا ہے اور جب وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھتا ہے تو ایک بلبلِ خوش نوا کی طرح چہکتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ہر آنے والی رکاوٹ اور مشکل انسان کی ترقی اور عروج کا پیش خیمہ ہے۔ منزل کا نہ ملنا مزید آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے۔ دشمن کا وجود انسان کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ کیونکہ وہ عمل پر اکساتا ہے۔

محترم باباجی! ..... عورتوں کا بھی جہادِ انسانیت میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مردوں کا ۔۔۔ مگر مجھے بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم جب بھی خلوص، قربانی، ایثار اور ہمت کی شمشیریں لے کر اُٹھتی ہیں زندگی کے ہر مقام پہ ہماری راہیں روکی جاتی ہیں۔ طرح طرح سے حوصلے پست کئے جاتے ہیں۔ ہماری ہمت، خلوص کو بناوٹ، دکھاوے سے تعبیر کر کے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا کب تک عورت کی عظمت اور قربانیوں سے انکار کرتی رہے گی ..... ؟ کیا یہ اُن عظیم ماؤں کو بھول سکتے ہیں جنہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صرف اس امید پر پروان چڑھایا کہ وہ اپنی زندگیاں خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ تاریخ کے اوراق کیوں اب تک طارق بن زیاد۔ خالد بن ولید اور محمد بن قاسم جیسے مجاہدوں کی بہادری کی گواہی دیتے ہیں؟ اگر اس زمانے کی مثال لیتے ہیں تو کون جھٹلا سکتا ہے اُن جرأت کے فسانوں کو، جن کی بہادری اور قربانیوں کی گواہی اب تک وہ زمین دیتی ہے جہاں ان کے مقدس خون بہے تھے۔ کیا اِن عظیم اور جہاد کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والے شہیدوں اور مجاہدوں کی ماؤں کا کوئی درجہ نہیں ..... ؟ ایک عورت کا جہاد اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اس کی تربیت دیئے ہوئے بچے دوسروں کے لئے عملی زندگی میں مشعلِ راہ بنیں۔

معزز سامعین! آج میں یہ بڑے دکھ سے پوچھتی ہوں کہ کہاں چلی گئی وہ محبت جس کو "فاتحِ عالم" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس نے ایک مردِ مومن کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف ایک بہن کی پکار پہ مملکتِ ہند کا نقشہ الٹ کر رکھ دے۔ کہاں ہیں اب وہ شمشیریں، جن کی چمک دمک سے سندھ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا پہ اسلام کے پرچم بلند ہو گئے۔

محترم باباجی! ..... آج جب ہمیں ایسی محبت جو قوم کو سدھار دے، جو دشمن کو اپنا بنا لے، نظر

نہیں آتی تو زبان بلے اختیار پکار اٹھتی ہے ؎

قدریں وہ زندگی کی الٰہی کدھر گئیں
جانے کہاں وہ جذبۂ فکر و عمل گیا؟

یہ لوگ جن کی شمشیروں کو اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ ان کی بدولت دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک فتح کے جھنڈے لہرا سکتے ہیں۔ ان میں کہاں ہے وہ جذبۂ عمل اور خدا پر یقینِ کامل ......؟ اب تو یہ شعر سن کر ایسا لگتا ہے کہ ہم سوال ہی کرتے رہ جائیں گے اور جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ کاش کہ اقبالؒ اب زندہ ہوتے تو میں ان سے ان لوگوں کے متعلق ضرور پوچھتی جن کا ذکر اور کردار صرف لفظوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ میں پھر بھی اس جذبۂ عمل اور محبت پر ایمان رکھتی ہوں جس نے قوموں کی تقدیریں بدل دیں۔ اگر میں یہ سب کچھ نہ بھی یاد رکھوں تو بھی اپنے رسولِ کریمؐ کی مثال اور ذات کو کیسے فراموش کر سکتی ہوں، جنہوں نے ہمیشہ چاہے گھر ہو یا میدانِ جنگ، پیار، محبت، اور عمل و قربانی کی تلوار تھامے رکھی۔ دنیا کی ہر شمشیر ان کی اسی شمشیر سے ٹکرا کر ٹوٹی۔ ہمارے رسولِ کریمؐ کی مخالفت، کس کس نے نہیں کی...... کون ان کی مشکلات اور مصائب سے واقف نہیں ہے مگر ہر مقام پر جہادی زندگی میں انہوں نے فتح و نصرت صرف اپنے خلوص اور جذبۂ ایمانی سے حاصل کی۔ اور ایمان تو پیدا ہی تب ہوتا ہے جب دل میں خدا کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ رسولِ کریمؐ کی مسلسل جد و جہد اور پیار و شفقت کی شمشیر کو سینے سے لگائے رکھنا ہی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔

آجکل جعلی محبت کے جلوے دکھا دکھا کر لوگ ہر روز نئے نئے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ اور ان پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ کالج اور یونیورسٹیاں تک جو بظاہر تعلیمی ادارے ہی لگتے ہیں ایسی محبتوں کے افسانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب تک یہاں محبتوں کے مظاہرے پیش نہ کئے جائیں کوئی ان اداروں میں قدم نہیں جما سکتا۔ اس تلخ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اب تو خلوص و پیار کے مفہوم ہی بدل چکے ہیں۔ عریانی، فیشن، بے باکی، دوسروں کا مذاق اڑانا ایک روایت بن چکی ہے۔ ان کے نزدیک سچی انسانی ہمدردی اور خلوص کا معیار ہی یہی رہ گیا ہے۔ یہ لوگ بھول چکے ہیں کہ محبت تو عظمت کی اس معراج کا نام ہے جہاں بندے خدا سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے سرکش اور باغیوں کے سر جھکا دیئے۔ ایسی فاتح محبت کا تو قرآن بھی بار بار تذکرہ کرتا ہے۔ اگر اس شفقت اور خلوص میں اتنی تاثیر نہ ہوتی تو جیسا کہ ہمیں تمثیلی طور پر سمجھایا گیا ہے جب حضورِ اکرمؐ سے حضرت جبرائیلؑ نے نافرمان بندوں کو پہاڑ گرا کر ختم کرنے کی اجازت طلب کی تھی تو کیوں آپ نے فوراً انکار کر دیا تھا...... کونسا جذبہ تھا جو حضورؐ کو دشمن سے بھی شفقت اور ہمدردی کرنے پر مجبور کر رہا تھا...... یہ وہی محبت کا ہی جذبہ تھا جو حضورِ اکرمؐ کو اپنے پروردگار سے تھا۔ اس کی ہر تخلیق سے تھا۔ وہ کیسے اپنے محبوب ہستی کی کسی بھی بنائی ہوئی چیز کی

نہیں آتی تو زبان بے اختیار پکار اُٹھتی ہے ؎

قدریں وہ زندگی کی الٰہی کدھر گئیں
جانے کہاں وہ جذبۂ عشق و عمل گیا؟

یہ لوگ جن کی شمشیروں کو اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ اُن کی بدولت دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک فتح کے جھنڈے لہرا سکتے ہیں۔ اِن میں کہاں ہے وہ جذبۂ عمل اور خدا پر یقینِ کامل ..... ؟ اب تو یہ شعر سُن کر ایسا لگتا ہے کہ ہم سوال ہی کرتے رہ جائیں گے اور جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ کاش کہ اقبالؒ اب زندہ ہوتے تو ہم اُن سے اُن لوگوں کے متعلق ضرور پوچھتی جن کا ذکر اور کردار صرف لفظوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مگر اِس کے ساتھ ساتھ ہی پھر بھی اس جذبۂ عمل اور محبت پر ایمان رکھتی ہوں جس نے قوموں کی تقدیریں بدل دیں۔ اگر میں یہ سب کچھ نہ بھی یاد رکھوں تو بھی اپنے رسولِ کریمؐ کی مثال اور ذات کو کیسے فراموش کر سکتی ہوں، جنہوں نے ہمیشہ چاہے گھر ہو یا میدانِ جنگ، پیار، محبت، اور عمل و قربانی کی تلوار تھامے رکھی۔ دنیا کی ہر شمشیر ان کی اسی شمشیر سے ٹکرا کر ٹوٹی۔ ہمارے رسولِ کریمؐ کی مخالفت، کس کس نے نہیں کی ..... کون اِن کی مشکلات اور مصائب سے واقف نہیں ہے مگر ہر مقام پر جہادی زندگی میں انہوں نے فتح و نصرت صرف اپنے خلوص اور جذبۂ ایمانی سے حاصل کی۔ اور ایمان تو پیدا ہی تب ہوتا ہے جب دل میں خدا کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ رسولِ کریمؐ کی مسلسل جدوجہد اور پیار و شفقت کی شمشیر کو سینے سے لگائے رکھنا ہی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔

آجکل جعلی محبت کے جلوے دکھا دکھا کر لوگ ہر روز نئے نئے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ اور اِن پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ کالج اور یونیورسٹیاں تک جو بظاہر تعلیمی ادارے ہی لگتے ہیں ایسی محبتوں کے افسانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب تک یہاں محبتوں کے مظاہرے پیش نہ کئے جائیں کوئی اِن اداروں میں قدم نہیں جما سکتا۔ اس تلخ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اب تو خلوص و پیار کے مفہوم ہی بدل چکے ہیں۔ عریانی، فیشن، بے باکی، دوسروں کا مذاق اڑانا ایک روایت بن چکی ہے۔ ان کے نزدیک سچی انسانی ہمدردی اور خلوص کا معیار ہی یہی رہ گیا ہے۔ یہ لوگ بھول چکے ہیں کہ محبت تو عظمت کی اس معراج کا نام ہے جہاں بندے خدا سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اِس نے بڑے بڑے سرکش اور باغیوں کے سر جھکا دیئے۔ ایسی فاتح محبت کا تو قرآن بھی بار بار تذکرہ کرتا ہے۔ اگر اس شفقت اور خلوص میں اتنی تاثیر نہ ہوتی تو جیسا کہ ہمیں تمثیلی طور پر سمجھایا گیا ہے جب حضور اکرمؐ سے حضرت جبرائیلؑ نے نافرمان بندوں کو پہاڑ گرا کر ختم کرنے کی اجازت طلب کی تھی تو کیوں آپ نے فوراً انکار کر دیا تھا ..... کونسا جذبہ تھا جو حضورؐ کو دشمن سے بھی شفقت اور ہمدردی کرنے پر مجبور کر رہا تھا ..... ؟ یہ صرف محبت کا ہی جذبہ تھا جو حضورِ اقدسؐ کو اپنے پروردگار سے تھا۔ اُس کی ہر تخلیق سے تھا۔ وہ کیسے اپنی محبوب ہستی کی کسی بھی بنائی ہوئی چیز کی

بربادی اور تباہی گوارا کر لیتے۔ آج ہم ہیں کہ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں اور خداوندتعالیٰ سے اپنی محبت اور عقیدت بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں مگر ہم اس کا عملی ثبوت کیا دیتے ہیں۔ ہم لوگ بے جان تو کیا اُس پاک ذات کی جاندار مخلوق سے دو بول ہمدردی کے کہنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہر فرد ایک دوسرے کی بربادی چاہتا ہے۔ ... نفرت کی کھیتی خوب ترقی کر رہی ہے۔ راہوں سے بھٹکانے والے تو بہت ہیں مگر راہ دکھانے والا شاید ہی کوئی ہو۔ جب ہم ایک معمار کی تخلیق سے اس قدر بُرا سلوک اور نفرت کرتے ہیں تو کس طرح اس سے محبت کرنے یا وفادار ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں ...... ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا!

بہادر قومیں مسلسل محنت اور کاوش کو اپنا شعار بناتی ہیں۔ آیئے ہم بھی اِس قعرِ غفلت سے نکل کر میدانِ عمل میں آئیں۔ اسلام اور انسانیت کا بول بالا اِسی صورت میں ہوگا جب انسانی ہمدردی اور باہمی تنظیم کے حق میں ہر فرد ہوگا۔ ہر اسلامی ملک ہوگا۔ اگر ہم بھی عہد کر لیں مسلسل محنت کا اور جذبہ پیدا کر لیں انسانیت کو سدھارنے کا، تو وہ وقت دور نہیں ہوگا جب ہم اپنا کھویا ہوا وقار اور سکون حاصل کر لیں گے۔ شرم و ندامت اور شکست کے جن جذبے نے آج ہمارے سر جھکائے ہوئے ہیں انشا اللہ ہم اس پر غالب آ جائیں گے ؎

غنچے کھل کر جو پھول بنتے ہیں۔ رنگ و بو کے "رسول" بنتے ہیں
عزم کی تابناک کرنوں سے۔ زندگی کے اصول بنتے ہیں!

۷- ابرار احمد

محترمہ صدر صاحبہ و معزز سامعین!

علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں تین بنیادی حقیقتوں کا ذکر آ گیا ہے اور وہ تینوں کی تینوں عالمگیر صداقتوں کی پیامبر اور ہمارے لئے ہی نہیں، نوعِ انسان کے لئے قندیلِ راہ ہیں ــــــ یقین محکم۔ عمل پیہم اور ان کے ساتھ عالمگیر محبت۔ ان کے مسلمہ ہونے میں کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہم ان کے حق میں دلائل پیش کر سکتے ہیں لیکن ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں نے اس وقت تک جتنی تقاریر سنی ہیں اُن میں ان مسلمات کی تائید میں دلائل ہی دیئے گئے۔ یہ بھی اپنے مقام پر اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بات "مسلمات اور ان کی تائید میں دلائل و شواہد" تک ہی رہنی چاہیئے یا اس سلسلے کو آگے بھی بڑھنا چاہیئے۔ کھُلے کھُلے الفاظ میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مثلاً عملِ پیہم کے حق میں دلائل دیکر ہمیں مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے یا عملِ پیہم کی کوئی مثال بھی پیش

بربادی اور تباہی گوارا کر لیتے۔ آج ہم ہیں کہ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں اور خداوند تعالیٰ سے اپنی محبت اور عقیدت بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں مگر ہم اس کا عملی ثبوت کیا دیتے ہیں۔ ہم لوگ بے جان تو کیا اُس پاک ذات کی جاندار مخلوق سے دو بول ہمدردی کے کہنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہر فرد ایک دوسرے کی بربادی چاہتا ہے۔۔۔۔ نفرت کی کھیتی خوب ترقی کر رہی ہے۔ راہوں سے بھٹکانے والے تو بہت ہیں مگر راہ دکھانے والا شاید ہی کوئی ہو۔ جب ہم ایک معمار کی تخلیق سے اس قدر بُرا سلوک اور نفرت کرتے ہیں تو کس طرح اس سے محبت کرنے یا وفادار ہونے کا دعوےٰ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
مَیں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا!

بہادر قومیں مسلسل محنت اور کاوش کو اپنا شعار بناتی ہیں۔ آیئے ہم بھی اِس قعرِ غفلت سے نکل کر میدانِ عمل میں آئیں۔ اسلام اور انسانیت کا بول بالا اِسی صورت میں ہو گا جب انسانی ہمدردی اور باہمی تنظیم کے حق میں ہر فرد ہو گا۔ ہر اسلامی ملک ہو گا۔ اگر ہم بھی عہد کر لیں مسلسل محنت کا اور جذبہ پیدا کر لیں انسانیت کو سدھارنے کا، تو وہ وقت دور نہیں ہو گا جب ہم اپنا کھویا ہوا وقار اور سکون حاصل کر لیں گے۔ شرم و ندامت اور شکست کے جس جذبے نے آج ہمارے سر جھکائے ہوئے ہیں انشاء اللہ ہم اس پر غالب آ جائیں گے ؎

غنچے کھل کر جو پھول بنتے ہیں۔ رنگ و بو کے "رسول" بنتے ہیں
عزم کی تابناک کرنوں سے۔ زندگی کے اصول بنتے ہیں!

۷۔ ابرار احمد

محترمہ صدر صاحبہ و معزز سامعین!

علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں تین بنیادی حقیقتوں کا ذکر آ گیا ہے اور وہ تینوں کی تینوں عالمگیر صداقتوں کی پیامبر اور ہمارے لئے ہی نہیں، نوعِ انسان کے لئے قندیلِ راہ ہیں ـــــ یقینِ محکم۔ عملِ پیہم اور ان کے ساتھ عالمگیر محبت۔ ان کے مسلّمہ ہونے میں کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہم ان کے حق میں دلائل پیش کر سکتے ہیں لیکن ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں نے اس وقت تک جتنی تقاریر سنی ہیں اُن میں ان مسلمات کی تائید میں دلائل ہی دیئے گئے۔ یہ بھی اپنے مقام پہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بات، مسلمات اور ان کی تائید میں دلائل و شواہد تک ہی رہنی چاہیئے یا اس سلسلے کو آگے بھی بڑھنا چاہیئے۔ کھلے کھلے الفاظ میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مثلاً عملِ پیہم کے حق میں دلائل دیکھ ہمیں مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے یا عملِ پیہم کی کوئی مثال بھی پیش

کرنی چاہیئے؛ باہر کی دنیا کو چھوڑ کر میں خود اپنے حلقے کی بات کرنا چاہتا ہوں اور اپنے احباب سے معذرت کے بعد ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں عام روش یہ ہو گئی ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ہم ان مسلمات پر عمل کیوں نہیں کرتے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ ان پر عمل اس وقت ممکن ہوگا جب یہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے اجتماعی امور ایسے ہیں جن پر عمل اسلامی نظام کے اندر ہی ممکن ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان مسلمات میں کوئی بھی ایسے نہیں جن پر ہم بحالاتِ موجودہ عمل پیرا ہو سکیں۔

محترم باباجی نے اسی کنونشن کے استقبالیہ میں اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ کتنے مسلمات ایسے ہیں جن پر ہم انفرادی طور پر آج بھی عمل کر سکتے ہیں۔ میں اس وقت، اس کی ایک عملی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مثال ہے ایک نوجوان طالب علم کی جس سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے مطالعہ اور باباجی کے درسِ قرآن کو غور و فکر سے سننے کے بعد اُسے یقینِ محکم ہو گیا کہ قرآنی نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس یقینِ محکم کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی امکانی حد تک ایسا کروں گا اور مسلسل کرتا رہوں گا، خواہ حالات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ اس نے اس کے لئے کیا کچھ کیا اُسے ذرا غور سے سنئے۔

نصف جنوری کی ایک تاریک ٹھٹھرتی رات۔ ایک سنسان سی گلی میں سیڑھیاں بجاتی پر تنگ ہوا۔ ایک تنگ سا مکان۔ رات کا پچھلا پہر ہے کہ جب جوانی کے زمانے کی نیند اپنے عین شباب پر ہوتی ہے کہ پانچ بجے ایک نوجوان قوتِ ارادی کے الارم سے اٹھتا ہے۔ سویٹر، جرابیں، ٹوپی، گلوبند، اور کوٹ پہنتا ہے اور سائیکل اٹھاتا ہے۔

اور پھر ایک وسیع و عریض سڑک پر ایک سائیکل ایک سمت کو تیزی سے بھاگی چلی جا رہی ہوتی ہے۔ اس شاہراہ پر اس وقت اور کوئی نہیں جا رہا ہوتا۔ وہ اکیلا ہوتا ہے۔ اذانیں ہونا شروع ہو جاتی ہیں، سائیکل کے پیڈل تیز تیز چلتے، شہر کے مشرقی حصہ کے محلہ، محمد آباد، کے آخری حصہ والی مسجد پر جا رکتے ہیں۔ مسجد کے اندر چند نفوس ہیں اور وہ بھی سارے ہی تقریباً بوڑھے، ادھیڑ عمر اور غلاف نما چادروں کے اندر لپٹے لپٹائے ہاتھ پاؤں سکیڑے۔ فقط اگلی صف کے سرے پر۔ اور پچھلی صف کے وسط میں، دو تین نوجوان، چہروں کی معصومیت سے طالب علم دکھائی دینے والے، بیٹھے ہوئے ہیں۔ نمازِ فجر کی جماعت ہوتی ہے۔ نمازی باہر نکلتے ہیں تو وہ نوجوان ان دو تین نوجوانوں سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ گھروں کے پتے نوٹ کرتا ہے اور پھر —— تین ہفتوں کے بعد وہی نوجوان، "سلیم کے نام خطوط" کی تینوں جلدیں اور "فردوسِ گم گشتہ" پڑھنے کے بعد، "انسان نے کیا سوچا" میں محوِ مطالعہ نظر آتے ہیں۔ پچھلے ایک عرصے سے قرآن کے پیغام کا یہ مبلغ ہر روز، کبھی اس مسجد میں دو تین روز مسلسل جانے کے

کرنی چاہیئے؟ باہر کی دنیا کو چھوڑ کر میں خود اپنے حلقے کی بات کرنا چاہتا ہوں اور اپنے احباب سے معذرت کے بعد ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں عام روش یہ ہو گئی ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ہم ان مسلمات پر عمل کیوں نہیں کرتے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ ان پر عمل اس وقت ممکن ہو گا جب یہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے اجتماعی امور ایسے ہیں جن پر عمل اسلامی نظام کے اندر ہی ممکن ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان مسلمات میں کوئی بھی ایسے نہیں جن پر ہم بحالاتِ موجودہ عمل پیرا ہو سکیں۔

محترم باباجی نے اسی کنونشن کے استقبالیہ میں اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ کتنے مسلمات ایسے ہیں جن پر ہم انفرادی طور پر آج بھی عمل کر سکتے ہیں۔ میں اس وقت، اس کی ایک عملی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مثال ہے ایک نوجوان طالب علم کی جس سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے مطالعہ اور باباجی کے درسِ قرآن کو غور و فکر سے سننے کے بعد اُسے یقینِ محکم ہو گیا کہ قرآنی نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس یقینِ محکم کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی امکانی حد تک ایسا کروں گا اور مسلسل کرتا رہوں گا، خواہ حالات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ اس نے اس کے لئے کیا کچھ کیا آپ ذرا غور سے سنئے۔

نصف جنوری کی ایک تاریک ٹھٹھرتی رات۔ ایک سنسان سی گلی میں سیڑھیاں بجاتی برقیلی ہوا۔ ایک تنگ سا مکان۔ رات کا پچھلا پہر ہے کہ جب جوانی کے زمانے کی نیند اپنے عین شباب پر ہوتی ہے کہ پانچ بجے ایک نوجوان قوتِ ارادی کے الارم سے اٹھتا ہے۔ سویٹر، جرابیں، ٹوپی، گلوبند، اور کوٹ پہنتا ہے اور سائیکل اٹھاتا ہے۔

اور پھر ایک وسیع و عریض سڑک پر ایک سائیکل ایک سمت کو تیزی سے بھاگی چلی جا رہی ہوتی ہے۔ اس شاہراہ پر اس وقت اور کوئی نہیں جا رہا ہوتا۔ وہ اکیلا ہوتا ہے۔ اذانیں ہونا شروع ہو جاتی ہیں، سائیکل کے پہیئے تیز تیز چلتے، شہر کے مشرقی حصہ کے محلہ، محمد آباد، کے آخری حصہ والی مسجد پر جا رکتے ہیں۔ مسجد کے اندر چند نفوس ہیں اور وہ بھی سارے ہی تقریباً بوڑھے، ادھیڑ عمر اور غلاف نما چادروں کے اندر لپٹے لپٹائے ہاتھ پاؤں سکیڑے۔ فقط اگلی صف کے سرے پر۔ اور پچھلی صف کے وسط میں، دو تین نوجوان، چہروں کی معصومیت سے طالب علم دکھائی دینے والے، بیٹھے ہوئے ہیں۔ نمازِ فجر کی جماعت ہوتی ہے۔ نمازی باہر نکلتے ہیں تو وہ نوجوان ان دو تین نوجوانوں سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ گھروں کے پتے نوٹ کرتا ہے اور پھر ——— تین ہفتوں کے بعد وہی نوجوان، "سلیم کے نام خطوط" کی تینوں جلدیں اور "فردوسِ گم گشتہ" پڑھنے کے بعد، "انسان نے کیا سوچا" میں محوِ مطالعہ نظر آتے ہیں۔ پچھلے ایک عرصے سے قرآن کے پیغام کا یہ مبلغ ہر روز، کبھی اس مسجد میں دو تین روز مسلسل جانے کے

بعد، کسی نئی مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا ہے۔ پہلے وہ روزانہ اپنے محلہ ہی کی مسجد میں نماز کے لئے جاتا تھا ـــــ اور ایسے میں کبھی ایک ہی مسجد سے چار پانچ قلوبِ سلیم نکل آتے، کبھی تین چار مساجد سے ایک بھی مائل بہ قرآن نہ ہوا۔ مگر اس نوجوان کو تبلیغِ قرآن کی اس شکل پر، نتائج خیزی کا یقین، اور اس کے لئے مسلسل کام لئے رکنے نہ دیا۔

گرمیوں کی ایک پسینہ پسینہ شام۔ اور اس ڈھلتی شام کے دُھندلکے میں، سائیکل کے دو پہیے کسی طرف لپک رہے ہیں اور پھر آج کے اخبار کے کالم "اطلاعات و اعلانات" میں شائع ہونے والی خبر کا مقام آ پہنچتا ہے۔ ایک علمی ادبی محفل منعقد ہوئی پڑی ہے۔ ہمیشہ کی طرح، بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے، دھواں دھار تقریروں ـــــ جن میں انسانی انا، خالی خولی علمی رعب کے سہارے، اذلی رقص کو دھراتی ہے ـــــ پر منتج ہو کر، یہ محفل ختم ہوتی ہے۔ دانش و بینش کے علمبردار باہر نکلتے ہیں۔ وہ نوجوان ـــــ محفل سے آج کے لئے منتخب کئے ہوئے، دو تین نوجوانوں سے تعارف حاصل کر رہا ہے۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے شہر کے آٹھ بڑے علمی، ادبی حلقوں میں سے پانچ کے ہفتہ واری اجلاسوں میں شرکت چکا تھا۔ اور ان آٹھ دس معروف علمی، ادبی مراکز کے بعد گلی محلوں میں واقع ایسی لاتعداد گمنام نشست گاہیں اس کے پیشِ نظر تھیں۔

شہر کے چودہ دینی دارالعلوموں کے بعد، آج وہ نوجوان، دارالعلوم جامعہ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ احاطے میں سے گذر کر طلباء کے اقامتی حجرے کی طرف بڑھتے ہوئے، اُس کے پاؤں تلے خشک، زرد پتے مسل کر چٹخے تو اُس نے اوپر دیکھا۔ سامنے برگد کا ایک پرانا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ شاخوں سے چمٹے ہوئے خشک، زرد، خزاں رسیدہ پتے، اور اُن کے درمیان، خال خال جھانکتے سبزی مائل پتے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ طلباء کے درمیان بیٹھا، موضوعاتِ دین پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا ـــــ پھر اُٹھتے ہوئے وہ درجۂ ثانویہ اور فاضل کے درجے کے تین طلباء سے "سلیم کے نام"۔ "مقامِ حدیث" اور "معراجِ انسانیت" کی جلدیں واپس لے رہا تھا اور ان کی جگہ دو تین اور کتابیں دے رہا تھا۔

برسات کی ایک گہری ہوتی ہوئی شام۔ اور اس وقت بوندا باندی پھر تیز ہو گئی تھی۔
پچھلے منگل کی طرح سول ہسپتال کے مین گیٹ سے ایک سائیکل تیزی سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ ـــــ اور پھر وہ نوجوان سائیکل کے کیریئر سے کتابیں اٹھا کر تیز تیز قدموں سے چل رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد سرجیکل وارڈ کے اس مریض کے پاس بیٹھا ہوا پایا جاتا ہے جس کی ٹانگیں پچھلے چار ماہ سے سٹینڈ سے بندھی پڑی ہیں۔

بعد، کسی نئی مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا ہے۔ پہلے وہ روزانہ اپنے محلہ ہی کی مسجد میں نماز کے لئے جاتا تھا ـــــ اور ایسے میں کبھی ایک ہی مسجد سے چار پانچ قلوبِ سلیم نکل آتے، کبھی تین چار مساجد سے ایک بھی مائل بہ قرآن نہ ہوا۔ مگر اس نوجوان کو تبلیغِ قرآن کی اس شکل پر، نتائج خیزی کا یقین، اور اس کے لئے مسلسل کام لئے رکھنے نہ دیا۔

گرمیوں کی ایک پسینہ پسینہ شام۔ اور اس ڈھلتی شام کے دُھندلکے میں، سائیکل کے دو پہیے کسی طرف لپک رہے ہیں اور پھر آج کے اخبار کے کالم "اطلاعات و اعلانات" میں شائع ہونے والی خبر کا مقام آ پہنچتا ہے۔ ایک علمی ادبی محفل منعقد ہوئی پڑی ہے۔ ہمیشہ کی طرح، بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے، دھواں دھار تقریروں ـــــ جن میں انسانی انا، خالی خولی علمی رعب کے سہارے، اذلی رقص کو دھراتی ہے ـــــ پہ منتج ہو کر، یہ محفل ختم ہوتی ہے۔ دانش و بینش کے علمبردار باہر نکلتے ہیں۔ وہ نوجوان ـــــ محفل سے آج کے لئے منتخب کئے ہوئے، دو تین نوجوانوں سے تعارف حاصل کر رہا ہے۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے شہر کے آٹھ بڑے علمی، ادبی حلقوں میں سے پانچ کے ہفتہ واری اجلاسوں میں شرکت چکا تھا۔ اور ان آٹھ دس معروف علمی، ادبی مراکز کے بعد گلی محلوں میں واقع ایسی لاتعداد گمنام نشست گاہیں اس کے پیشِ نظر تھیں۔

شہر کے چودہ دینی دارالعلوموں کے بعد، آج وہ نوجوان، دارالعلوم جامعہ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ احاطے میں سے گذر کر طلباء کے اقامتی حجرے کی طرف بڑھتے ہوئے، اُس کے پاؤں تلے خشک، زرد پتے مسل کر چٹخے تو اُس نے اوپر دیکھا۔ سامنے برگد کا ایک پرانا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ شاخوں سے چمٹے ہوئے خشک، زرد، خزاں رسیدہ پتے، اور اُن کے درمیان، خال خال جھانکتے سبزی مائل پتے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ طلباء کے درمیان بیٹھا، موضوعاتِ دین پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا ـــــ پھر اُٹھتے ہوئے وہ درجۂ ثانویہ اور فاضل کے درجے کے تین طلباء سے "سلیم کے نام"۔ "مقامِ حدیث" اور "معراجِ انسانیت" کی جلدیں واپس لے رہا تھا اور ان کی جگہ دو تین اور کتابیں دے رہا تھا۔

برسات کی ایک گہری ہوتی ہوئی شام۔ اور اس وقت بوندا باندی پھر تیز ہو گئی تھی۔

پچھلے منگل کی طرح سول ہسپتال کے مین گیٹ سے ایک سائیکل تیزی سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ ـــــ اور پھر وہ نوجوان سائیکل کے کیریئر سے کتابیں اٹھا کر تیز تیز قدموں سے چل رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد سرجیکل وارڈ کے اس مریض کے پاس بیٹھا ہوا پایا جاتا ہے جس کی ٹانگیں پچھلے چار ماہ سے سٹینڈ سے بندھی پڑی ہیں۔

اور آج وہ نوجوان "معراجِ انسانیت" واپس لیتے ہوئے اُسے "شاہکارِ رسالت" پکڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہی نوجوان جنرل وارڈ میں پمفلٹ اور کتابچے تقسیم کر رہا تھا۔

بہار کی ایک چمکتی دھوپ والی صبح۔ اتوار کا دن۔ تین ہفتے ہوئے، میٹرک کا نتیجہ نکلا ہے اور شہر کے آٹھ سکولوں کے بعد آج اس کے سامنے مسلم ماڈل سکول کے اوّل۔ دوم اور سوم آنے والے طالب علموں کے گھر تھے۔ پھر وہ نوجوان، اس سکول کے دوم آنے والے طالب علم کے ساتھ اس کے گھر پہ بیٹھا تھا اور جب وہ الوداعی مصافحے کے لئے اُٹھے تو میز پہ "اسبابِ زوالِ اُمت" کی کتاب پڑی تھی۔

اور پھر وہ حسین اتفاق ——— کہ کچھ ہی وقت بعد، شہر سے باہر نئی بستی سے واپسی پہ، اس لئے جونہی شہر کی جرنیلی سڑک کا موڑ کاٹا تو لاشعوری طور پہ، اس کی نگاہیں پیچھے رہ جانے والی بستی کی طرف اٹھ گئیں اور اتفاق سے اس مکان سے جا ٹکرائیں جہاں سے وہ ابھی ہو کر آ رہا تھا۔ گھر کے بیرونی گیٹ پہ، جہاں سے وہ جدا ہوئے تھے ——— اسی سکول کا دوم آنے والا طالبعلم وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اس کا سر، ہاتھ سے پکڑی ہوئی کسی چیز پہ جھکا ہوا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے "سلیم کے نام پہلے خط" میں محو ہو چکا تھا۔

بدھ کا دن۔ موسلا دھار بارش کے بعد جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ شہر سے باہر واقع برانچ سنٹرل جیل کی بڑی بڑی اور کالی سیاہ دیواریں، ہو چکنے والی بارش سے یوں بھیگی کھڑی تھیں، جیسے کوئی کسی احساس کی شدت سے پسینہ پسینہ ہوا ہو۔

آج ملاقاتیوں کا دن ہے۔ پانچ بجے سے سات بجے کے اس وقت میں بیس منٹ رہتے ہیں۔ ایک سائیکل تیزی سے آ کر کھڑی ہوتی ہے۔

——— اور پھر وہی نوجوان، کلاس لے اور کلاس سی کی بیرکوں کے سامنے، سلاخوں کے بیچ میں سے، باتوں، کتابوں اور پمفلٹوں کا تبادلہ کر رہا ہوتا ہے کہ اتنے میں وقت ختم ہونے کا گھنٹہ بج اُٹھتا ہے۔

اس نوجوان کے اس عملی پروگرام کی داستان تو طول طویل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس نتیجہ تک اس کی تگ و تاز ہمیں پہنچاتی ہے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک فرد، تن تنہا، بلا ساز و سامان بھی یقینِ محکم کے بعد عملِ پیہم کی کوئی راہ اختیار کر لے تو اس کے محسوس اور درخشندہ نتائج مرتب ہو کر رہتے ہیں۔ لہٰذا، ہم نوجوانوں کو اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیئے کہ نو من تیل ہوگا، تب ہی رادھا ناچے گی۔ ہمیں ایک پروگرام کو لے کر تنہا اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے، منزل خود آ کر ہمارے قدم چوم لے گی۔

اور آج وہ نوجوان "معراجِ انسانیت" واپس لیتے ہوئے اُسے "شاہکارِ رسالت" پکڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہی نوجوان جنرل وارڈ میں پمفلٹ اور کتابچے تقسیم کر رہا تھا۔

بہار کی ایک چمکتی دھوپ والی صبح - اتوار کا دن - تین ہفتے ہوئے، میٹرک کا نتیجہ نکلا ہے اور شہر کے آٹھ سکولوں کے بعد آج اس کے سامنے مسلم ماڈل سکول کے اوّل - دوم اور سوم آنے والے طالب علموں کے گھر تھے۔ پھر وہ نوجوان، اس سکول کے دوم آنے والے طالب علم کے ساتھ اس کے گھر پہ بیٹھا تھا اور جب وہ الوداعی مصافحے کے لئے اُٹھے تو میز پہ "اسبابِ زوالِ اُمت" کی کتاب پڑی تھی۔

اور پھر وہ حسین اتفاق ——— کہ کچھ ہی وقت بعد، شہر سے باہر نئی بستی سے واپسی پہ، اس نے جونہی شہر کی جرنیلی سڑک کا موڑ کاٹا تو لاشعوری طور پہ، اس کی نگاہیں پیچھے رہ جانے والی بستی کی طرف اٹھ گئیں اور اتفاق سے اس مکان سے جا ٹکرائیں جہاں سے وہ ابھی ہو کر آ رہا تھا۔ گھر کے بیرونی گیٹ پر، جہاں سے وہ جدا ہوئے تھے ——— اسی سکول کا دوم آنے والا طالب علم وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اس کا سر، ہاتھ سے پکڑی ہوئی کسی چیز پہ جھکا ہوا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے "سلیم کے نام" پہلے خط میں محو ہو چکا تھا۔

بدھ کا دن - موسلا دھار بارش کے بعد جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ شہر سے باہر واقع برانچ سنٹرل جیل کی بڑی بڑی اور کالی سیاہ دیواریں، ہو چکنے والی بارش سے یوں بھیگی کھڑی تھیں، جیسے کوئی کسی احساس کی شدت سے پسینہ پسینہ ہوا ہو۔

آج ملاقاتیوں کا دن ہے۔ پانچ بجے سے سات بجے کے اس وقت میں بیس منٹ رہتے ہیں۔ ایک سائیکل تیزی سے آ کر کھڑی ہوتی ہے۔

——— اور پھر وہی نوجوان، کلاس لیے اور کلاس سی کی بیرکوں کے سامنے، سلاخوں کے بیچ میں سے، باتوں، کتابوں اور پمفلٹوں کا تبادلہ کر رہا ہوتا ہے کہ اتنے میں وقت ختم ہونے کا گھنٹہ بج اُٹھتا ہے۔

اس نوجوان کے اس عملی پروگرام کی داستان تو طول طویل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس نتیجہ تک اُس کی تگ و تاز ہمیں پہنچاتی ہے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک فرد، تن تنہا، بلا سازو سامان بھی یقینِ محکم کے بعد عملِ پیہم کی کوئی راہ اختیار کر لے تو اس کے محسوس اور درخشندہ نتائج مرتب ہو کر رہتے ہیں۔ لہٰذا، ہم نوجوانوں کو اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیئے کہ نومن تیل ہوگا، تب ہی رادھا ناچے گی۔ ہمیں ایک پروگرام کو لے کر تنہا اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے، منزل خود آ کر ہمارے قدم چوم لے گی۔

۸۔ صالحہ نعیمی

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم!
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم

علامہ اقبالؒ کا یہ بصیرت افروز پیغام جو ہمارے آج کے مذاکرے کا عنوان ہے، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ایک غیر متبدل اصول کا ترجمان ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یقین و ایمان، عملِ مسلسل اور محبت و رحمت ہی اصلِ حیات ہیں جن کی بدولت ہم کائنات کی سرکش قوتوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اور اُن پر قابو پاتے ہوئے خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق، انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانیت کی نشو و نما کر سکتے ہیں اور پوری دل جمعی کے ساتھ حصولِ مقاصد کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے منزلِ مراد کی طرف گامزن رہ سکتے ہیں۔ یوں ہم ایک ایسے متوازن منصفانہ اور مستحکم معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں، جہاں تمام افراد معاشرہ اپنے حقوق و فرائض کلی طور پر نبھاتے چلے جاتے ہیں اور انسانیت کو اس کی معراج نصیب ہو جاتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یقین و عمل اور محبت کے نتائج اس قدر روح پرور کیونکر ثابت ہو سکتے ہیں ـــــ تو آیئے اس نکتے کو سمجھنے کے لئے علامہ کے اس شعر پر غور کریں جس میں انہوں نے (قرآنی تعلیم کے عین مطابق) زندگی کو جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ جہاد، حصولِ مقصد کے لئے عملِ متواتر، سعیِ پیہم اور تگ و تاز لاانتہا ہی کا دوسرا نام ہے۔ طبیعی نقطۂ نگاہ سے ہی دیکھئے تو سعی و کاوش نہ صرف زندگی کا تقاضا ہے، بلکہ خود زندگی ہے۔ اس لئے حرکت و حرارت کے بغیر (SURVIVAL) ناممکن ہے۔ عظیم الجثہ حیوانات سے لے کر ایک جرثومے تک کو لے لیجئے۔ سب ہی آپ کو اس مقولے پر، عمل پیرا نظر آئیں گے کہ "حرکت میں برکت ہے"۔

لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر سعی و عمل صرف ایک طبیعی فرض نہیں رہتا بلکہ بہت بلند حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ کائنات میں حق و باطل اور تعمیری و تخریبی قوتیں ہر دم ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ مجاہد کا مقصد باطل کو نیچا دکھا کر نورِ حق کو چار سو پھیلانا ہے۔ اس کش مکش اور تصادم کی آخری جملا نگاہ میدانِ جنگ ہوتا ہے جہاں مجاہد سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمن کو زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ جہاد کی آخری اور بلند ترین شکل ہے، ورنہ قرآن کی رو سے ہر مردِ مؤمن اسلام کا مجاہد ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی شعبۂ حیات سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو، ہر آن حق کی خاطر مصروفِ عمل رہتا ہے۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریق ہے جس کو اپنا کر مجاہد اپنا فریضہ کامیابی سے ادا کر سکتا ہے۔ پوچھنے والے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کیا (GUARANTEE) ہے کہ

۸۔ صالحہ نغمی

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم؛
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم

علامہ اقبالؒ کا یہ بصیرت افروز پیغام جو ہمارے آج کے مذاکرے کا عنوان ہے، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ایک غیر متبدل اصول کا ترجمان ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یقین و ایمان، عملِ مسلسل اور محبت و رحمت ہی اصلِ حیات ہیں جن کی بدولت ہم کائنات کی سرکش قوتوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اور اُن پر قابو پاتے ہوئے خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق، انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانیت کی نشو و نما کر سکتے ہیں اور پوری دل جمعی کے ساتھ حصولِ مقاصد کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے منزلِ مراد کی طرف گامزن رہ سکتے ہیں۔ یوں ہم ایک ایسے متوازن منصفانہ اور مستحکم معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں، جہاں تمام افراد معاشرہ اپنے حقوق و فرائض کلی طور پر نبھاتے چلے جاتے ہیں اور انسانیت کو اس کی معراج نصیب ہو جاتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یقین، عمل اور محبت کے نتائج اس قدر روح پرور کیونکر ثابت ہو سکتے ہیں ـــــ تو آیئے اس نکتے کو سمجھنے کے لئے علامہ کے اس شعر پر غور کریں جس میں انہوں نے (قرآنی تعلیم کے عین مطابق) زندگی کو جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ جہاد، حصولِ مقصد کے لئے عملِ متواتر، سعیِ پیہم اور تگ و تاز لاانتہا ہی کا دوسرا نام ہے۔ طبیعی نقطۂ نگاہ سے ہی دیکھئے تو سعی و کاوش نہ صرف زندگی کا تقاضا ہے، بلکہ خود زندگی ہے۔ اس لئے حرکت و حرارت کے بغیر (SURVIVAL) ناممکن ہے۔ عظیم الجثہ حیوانات سے لے کر ایک جرثومے تک کو لے لیجئے۔ سب ہی آپ کو اس مقولے پر، عمل پیرا نظر آئیں گے کہ "حرکت میں برکت ہے"۔

لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر سعی و عمل صرف ایک طبیعی فرض نہیں رہتا بلکہ بہت بلند حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ کائنات میں حق و باطل اور تعمیری و تخریبی قوتیں، ہر دم ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ مجاہد کا مقصد باطل کو نیچا دکھا کر نورِ حق کو چار سو پھیلانا ہے۔ اس کش مکش اور تصادم کی آخری جملا نگاہ میدانِ جنگ ہوتا ہے جہاں مجاہد سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمن کو زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ جہاد کی آخری اور بلند ترین شکل ہے، ورنہ قرآن کی رو سے ہر مردِ مؤمن اسلام کا مجاہد ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی شعبۂ حیات سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو، ہر آن حق کی خاطر مصروفِ عمل رہتا ہے۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریق ہے جس کو اپنا کر مجاہد اپنا فریضہ کامیابی سے ادا کر سکتا ہے۔ پوچھنے والے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کیا (GUARANTEE) ہے کہ

حق باطل پر غالب آ جائے گا! فتح سرکش عناصر کو بھی تو حاصل ہو سکتی ہے! اس اہم سوال کا جواب آسان ہے۔ قرآن کریم ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پہنچاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم غالب آ کر رہو گے۔ چنانچہ اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآن انسان کو کامرانیٔ حیات میں سرخرو ہونے کے لئے اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ کا درس دیتا ہے ـــــ اور یہی وہ سنہرے اصول ہیں جو ایک کامیاب و شاداب زندگی کی ضمانت ہیں۔

حاضرین! آپ غور کیجئے کہ خالقِ کائنات پر ایمان و یقین، ایک صالح زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں لمحہ بہ لمحہ رونما ہونے والے مظاہر قدرت قدم قدم پر انسانی ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان سوالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے اور کیوں ہے؟ خالقِ کائنات کون ہے اور تخلیقِ کائنات کا مقصد کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب، انسان ازل سے ڈھونڈتا چلا آیا ہے۔ لیکن تسلی بخش جواب کوئی نہیں پا سکا، ماسوا اس کے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور دینی تعلیم سے روشناس ہوا۔ یہ مومن ہی ہے جس نے سمجھا کہ کائنات خدائے واحد کی تخلیق ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام کائناتی قوتیں اللہ تعالیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل رہیں۔ اس کے برعکس کافر یا ملحد تذبذب، بے یقینی اور منتشر خیالی کا شکار ہو کر سکون و اطمینان کی نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم ہو جاتا ہے اور زندگی کے حقائق سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔

معزز سامعین! اس بحث سے یقین و ایمان کی اہمیت و افادیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ عمل کے بغیر خالی ایمان سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ذرا سوچئے کہ اس معاشرے کی کیا صورت ہو گی جہاں سب کے سب اللہ اور اس کے دین پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ خود ہی کہیئے کہ ایسے لوگوں کو زندگی کی کتنی کامیابیاں اور کتنی ترقیاں نصیب ہو سکیں گی! چلئے بغیر تو پانی بھی نہیں پیا جاتا، چہ جائے کہ انسانیت کی نشو و نما کی جا سکے! زندگی کی خوشگواریوں سے فیضیاب ہونے کے لئے سعی و کاوش اور محنت و مشقت سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اسی طریقے سے انسانی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور کائنات پر کمندیں ڈال کر نت نئے جہان دریافت کر سکتا ہے۔

یہ بھی سوچئے کہ اگر صرف عمل ہی عمل ہو، لیکن ایمان نہ ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل، غلط اور صحیح میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے ـــــ گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے انسان کے غلط اور تباہ کن اعمال کا نتیجہ تو ظاہر ہے۔ دنیا میں بھی تباہی اور آخرت میں بھی بربادی ـــــ اس کے برعکس اگر انسان صرف طبیعی قانون کے مطابق سعی و کاوش کرے تب بھی تو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اس کو اس دنیا میں تو ضرور کامیابی نصیب ہوگی لیکن خدا اور اس کے دین پر ایمان نہ رکھنے کی

حق باطل پر غالب آجائے گا! فتح سرکش عناصر کو بھی تو حاصل ہو سکتی ہے! اس اہم سوال کا جواب آسان ہے۔ قرآن کریم ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پہنچاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم غالب آکر رہوگے۔ چنانچہ اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآن انسان کو کارزارِ حیات میں سرخرو ہونے کے لئے اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کا درس دیتا ہے ـــــ اور یہی وہ سنہرے اصول ہیں جو ایک کامیاب و شاداب زندگی کی ضمانت ہیں۔

حاضرین! آپ غور کیجئے کہ خالقِ کائنات پر ایمان و یقین، ایک صالح زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں لمحہ بہ لمحہ رونما پذیر ہونے والے مظاہر قدرت قدم قدم پر انسانی ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان سوالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے اور کیوں ہے؟ خالقِ کائنات کون ہے اور تخلیقِ کائنات کا مقصد کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب، انسان ازل سے ڈھونڈتا چلا آیا ہے۔ لیکن تسلی بخش جواب کوئی نہیں پا سکا، ماسوا اس کے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور دینی تعلیم سے روشناس ہوا۔ یہ مومن ہی ہے جس نے سمجھا کہ کائنات خدائے واحد کی تخلیق ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام کائناتی قوتیں اللہ تعالیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل رہیں۔ اس کے برعکس کافر یا ملحد تذبذب، بے یقینی اور منتشر خیالی کا شکار ہو کر سکون و اطمینان کی نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم ہو جاتا ہے اور زندگی کے حقائق سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔

معزز سامعین! اس بحث سے یقین و ایمان کی اہمیت و افادیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ عمل کے بغیر خالی ایمان سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ذرا سوچئے کہ اس معاشرے کی کیا صورت ہوگی جہاں سب کے سب اللہ اور اُس کے دین پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ خود ہی کہئے کہ ایسے لوگوں کو زندگی کی کتنی کامیابیاں اور کتنی ترقیاں نصیب ہو سکیں گی! ہلے بغیر تو پانی بھی نہیں پیا جاتا، چہ جائے کہ انسانیت کی نشو و نما کی جا سکے! زندگی کی خوشگواریوں سے فیضیاب ہونے کے لئے سعی و کاوش اور محنت و مشقت سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اسی طریقے سے انسانی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور کائنات پر کمندیں ڈال کر نت نئے جہان دریافت کر سکتا ہے۔

یہ بھی سوچئے کہ اگر صرف عمل ہی عمل ہو، لیکن ایمان نہ ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل، غلط اور صحیح میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے ـــــ گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے انسان کے غلط اور تباہ کن اعمال کا نتیجہ تو ظاہر ہے۔ دنیا میں بھی تباہی اور آخرت میں بھی بربادی ـــــ اس کے برعکس اگر انسان صرف طبعی قانون کے مطابق سعی و کاوش کرے بھی تو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اس کو اس دنیا میں تو ضرور کامیابی نصیب ہوگی لیکن خدا اور اس کے دین پر ایمان نہ رکھنے کی

بنا پر وہ اُخروی زندگی کی شادابیوں سے محروم کر دیا جائے گا۔

الغرض دنیاوی اور اُخروی دونوں زندگیوں کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہونے کے لیے ایمان و عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں اور اسی لئے قرآن نے انسان کو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی تعلیم دی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآنِ کریم ہمیں ایک اور چیز کا بھی درس دیتا ہے اور ہے عالمگیر محبت و رحمت اور انسانی وحدت و یگانگت اللہ تعالےٰ کے پروگرام کا مقصود و منتہا یہ ہے کہ مختلف اقوامِ عالم کے درمیان رنگ و نسل یا مذہب اور (IDEOLOGY) کی بنا پر پائی جانے والی نفرت کو دور کر کے اُمتِ واحدہ کی تشکیل کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سب انسانوں کا خادمِ و محبت کی ڈوری میں بندھ جانا لازمی ہے۔ چنانچہ انسان کا ہر عمل انسانیت کے لئے محبت و رحمت کی نوید ہونا چاہیئے۔ یعنی ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اب تصوّر کیجئے کہ یقین و عمل اور محبت و رحمت کی نعمتوں سے بہرہ یاب معاشرے کی عملی شکل و صورت کیا ہوگی ـــــ یہ ایک بہت حسین تصوّر ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فرمان کے مطابق ایسے معاشرے کے افراد کو نہ کوئی حزن ہوگا اور نہ کوئی خوف۔ سکون و اطمینان اور خلوص اور چاہت کی دولت سے مالا مال اس معاشرے میں چار سو حق کا نور چھایا ہوگا اور عناصرِ فطرت سے لے کر انسانی آبادیاں تک اسلامی مملکت کا گوشہ گوشہ حسین نظر آئے گا۔

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن

اور یہی وہ تصوّر ہے حاضرینِ کرام! جو آج سے اٹھائیس سال قبل قیامِ پاکستان کی جدوجہد کا محرک بنا تھا۔ یہی وہ آئیڈیل ہے میرے بزرگو! جس کے حصول کے لئے آپ نے مال اور خون کی بے شمار قربانیاں دے کر تاریخ کے اوراق پر مجاہدانہ سرفروشی کی عظیم داستانیں بکھیر دی تھیں۔ آپ کا مقصد آپ کا آئیڈیل اور آپ کا (TARGET) ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام تھا جہاں آپ پوری آزادی اور لگن کے ساتھ اپنے دینی فرائض سرانجام دے کر دنیا کے نقشے پر ایک سرفراز و بامراد قوم کی حیثیت سے اُبھر سکتے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے قائدِ اعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں اُن کے زریں اصولوں۔ یعنی اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم پر عمل کرتے ہوئے کام کام اور صرف کام کو اپناتے ہوئے بھرپور جدوجہد کی، اور یقین و عمل کے اس امتحان سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو سرخرو نکلے۔

لیکن اس کے بعد کیسی کایا پلٹی! حصولِ مقصد کے بعد آپ اپنی راہِ مستقیم سے بھٹک کیوں گئے؟ قائدِ اعظمؒ کی آنکھیں بند ہوتے ہی آپ نے ان کے ارشادات سے آنکھیں کیوں پھیر لیں؟ اور جان، مال اور آبرو کی بے حساب قربانیاں دے کر حاصل کئے جانے والے اس وطنِ عزیز کی آپ نے کیا

بنا پر وہ اُخروی زندگی کی شادابیوں سے محروم کر دیا جائے گا۔

الغرض دنیاوی اور اُخروی دونوں زندگیوں کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہونے کے لیے ایمان و عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں اور اسی لئے قرآن نے انسان کو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی تعلیم دی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآنِ کریم ہمیں ایک اور چیز کا بھی درس دیتا ہے اور وہ ہے عالمگیر محبت و رحمت اور انسانی وحدت و یگانگت اللہ تعالےٰ کے پروگرام کا مقصود و منتہا یہ ہے کہ مختلف اقوامِ عالم کے درمیان رنگ و نسل یا مذہب اور (IDEOLOGY) کی بنا پر پائی جانے والی نفرت کو دور کر کے اُمّتِ واحدہ کی تشکیل کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سب انسانوں کا خلوص و محبت کی ڈوری میں بندھ جانا لازمی ہے۔ چنانچہ انسان کا ہر عمل انسانیت کے لئے محبت و رحمت کی نوید ہونا چاہیئے۔ یعنی ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اب تصوّر کیجئے کہ یقین و عمل اور محبت و رحمت کی نعمتوں سے بہرہ یاب معاشرے کی عملی شکل و صورت کیا ہوگی ـــــ یہ ایک بہت حسین تصوّر ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فرمان کے مطابق ایسے معاشرے کے افراد کو نہ کوئی حزن ہوگا اور نہ کوئی خوف۔ سکون و اطمینان اور خلوص اور چاہت کی دولت سے مالا مال اس معاشرے میں چار سو حق کا نور چھایا ہوگا اور عناصرِ فطرت سے لے کر انسانی آبادیاں تک اسلامی مملکت کا گوشہ گوشہ حسین نظر آئے گا ؎

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن

اور یہی وہ تصوّر ہے حاضرینِ کرام! جو آج سے اٹھائیس سال قبل قیامِ پاکستان کی جد و جہد کا محرک بنا تھا۔ یہی وہ آئیڈیل ہے میرے بزرگو! جس کے حصول کے لئے آپ نے مال اور خون کی بے شمار قربانیاں دے کر تاریخ کے اوراق پر مجاہدانہ سرفروشی کی عظیم داستانیں بکھیر دی تھیں۔ آپ کا مقصد، آپ کا آئیڈیل اور آپ کا (TARGET) ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام تھا جہاں آپ پوری آزادی اور لگن کے ساتھ اپنے دینی فرائض سرانجام دے کر دنیا کے نقشے پر ایک سرفراز و بامراد قوم کی حیثیت سے اُبھر سکتے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے قائدِ اعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں اُن کے زریں اصولوں۔ یعنی اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم پر عمل کرتے ہوئے کام کام اور صرف کام کو اپناتے ہوئے بھرپور جد و جہد کی، اور یقین و عمل کے اس امتحان سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو سرخرو نکلے۔

لیکن اس کے بعد کیسی کایا پلٹی! حصولِ مقصد کے بعد آپ اپنی راہِ مستقیم سے بھٹک کیوں گئے؟ قائدِ اعظمؒ کی آنکھیں بند ہوتے ہی آپ نے ان کے ارشادات سے آنکھیں کیوں پھیر لیں؟ اور جان، مال اور آبرو کی بے حساب قربانیاں دے کر حاصل کئے جانے والے اس وطنِ عزیز کی آپ نے کیا

ڈگنت بنائی......؟

یہ میرے اور میرے ہم عمروں کے ذہنوں ذہنوں میں کلبلانے والے وہ سوالات ہیں جن کا جواب ایک ایسی اذیت ناک حقیقت کے روپ میں ہم اور آپ کے سامنے ہے جس سے گھبرا کر آپ ہم بچوں سے لاکھ آنکھیں چرانا چاہیں پہ نہیں چرا سکتے۔ اس لئے کہ اٹھائیس سال کے عرصے میں آپ کی اولاد جوان ہو چکی ہے۔ کل کے بچے اب بچے نہیں رہے۔ اب ہم ایک ذی شعور اور ذی فہم نسل کے قالب میں ڈھل چکے ہیں جو سب کچھ دیکھتی ہے اور سنتی ہے اور جو حقائق کو دلیل و برہان کی کسوٹی پر پرکھنا جانتی ہے۔ آپ یاد رکھئے کہ آج کی نوجوان نسل آپ کی خامیوں اور کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو چکی ہے۔ وہ اچھی سمجھ چکی ہے کہ اس نے اپنے اسلاف سے کیا میراث پائی ہے! اس کے آبا نے خود کس قسم کی زندگی گذاری ہے اور اپنے بچوں کو کیا دیا ہے۔

آیئے بزرگانِ من! اگر حوصلہ ہے تو اپنا نامۂ اعمال اپنے بچوں ہی کی زبانی سن لیجئے۔

آپ منافقین کی ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جو خود کو جماعتِ مومنین کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ آپ یقین و ایمان کے بلند بانگ دعوے کرنے والے وہ گم کردہ راہ افراد ہیں جن کے دل و دماغ شرک و الحاد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

آپ اپنے بچوں کو صداقت و دیانت کا درس دینے والے ایسے ماں باپ ہیں جن کی زندگیاں دروغ اور خیانت میں لتھڑی ہوئی ہیں۔

آپ اولاد کو قوتِ بازو پر انحصار کی تلقین کرنے والے ایسے والدین ہیں جن کی زندگی کی گاڑی رشوت و سفارش کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں سرکتی۔

یہ آپ ہی ہیں میرے بزرگو! جنہوں نے ہمیں کتابوں میں اسلام کی اعلیٰ اقدار کا درس دیا ہے اور اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار سے روشناس کرایا ہے۔ مگر عملی طور پر ہمیں چوربازاری، ذخیرہ اندوزی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، جبر و استبداد، سگریٹ و شراب، خود غرضی اور ناانصافی کی تعلیم دی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے ہمیں قرآنِ حکیم کو چومنا، آنکھوں سے لگانا اور کئی کئی دفعہ قرآن ختم کرنا تو سکھا دیا لیکن اپنے ساتھ ہمیں بھی اس کتابِ عظیم کے مفہوم سے ناآشنا رکھا ہے۔

میں آپ سے صرف یہ سوال کرنا چاہتی ہوں میرے بزرگو! کہ آپ کا کوئی ایک فعل بھی ایسا ہے جو آپ کے قول سے متصادم نہ ہو؟ ———— ہر طرف تضاد ہی تضاد ہے! ————

کیا یہی ہے وہ حسین و دلکش پاکستان جس کو لے کر رہنے کے نعرے آپ نے ربع صدی پیشتر لگائے تھے......یہ کیا یہی ہے اقبالؒ کے حسین خواب کی تعبیر! اور قائدِ اعظمؒ کی جدو جہد کا ماحصل؟!

اس پہ طرّہ یہ کہ آپ اپنے اس سنگین ترین جرم کا اقرار کرنے کی بجائے ہم بچوں پر طرح طرح

ذرگت بنائی.....؟

یہ میرے اور میرے ہم عمروں کے ذہنوں میں کلبلانے والے وہ سوالات ہیں جن کا جواب ایک ایسی اذیت ناک حقیقت کے روپ میں ہم اور آپ کے سامنے ہے جس سے گھبرا کر آپ ہم بچوں سے لاکھ آنکھیں چرانا چاہیں پر نہیں چرا سکتے۔ اس لئے کہ اٹھائیس سال کے عرصے میں آپ کی اولاد جوان ہو چکی ہے۔ کل کے بچے اب بچے نہیں رہے۔ اب ہم ایک ذی شعور اور ذی فہم نسل کے قالب میں ڈھل چکے ہیں جو سب کچھ دیکھتی ہے اور سنتی ہے اور جو حقائق کو دلیل و برہان کی کسوٹی پر پرکھنا جانتی ہے۔ آپ یاد رکھئے کہ آج کی نوجوان نسل آپ کی خامیوں اور کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو چکی ہے۔ وہ اچھی سمجھ چکی ہے کہ اس نے اپنے اسلاف سے کیا میراث پائی ہے! اس کے آباء نے خود کس قسم کی زندگی گذاری ہے اور اپنے بچوں کو کیا دیا ہے۔

آیئے بزرگانِ من! اگر حوصلہ ہے تو اپنا نامۂ اعمال اپنے بچوں ہی کی زبانی سن لیجئے۔

آپ منافقین کی ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جو خود کو جماعتِ مومنین کہلوانے میں فخر محسوس ہے۔ آپ یقین و ایمان کے بلند بانگ دعوے کرنے والے وہ گم کردہ راہ افراد ہیں جن کے دل و دماغ شرک و الحاد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

آپ اپنے بچوں کو صداقت و دیانت کا درس دینے والے ایسے ماں باپ ہیں جن کی زندگیاں دروغ اور خیانت میں لتھڑی ہوئی ہیں۔

آپ اولاد کو قوتِ بازو پر انحصار کی تلقین کرنے والے ایسے والدین ہیں جن کی زندگی کی گاڑی رشوت و سفارش کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی۔

یہ آپ ہی ہیں میرے بزرگو! جنہوں نے ہمیں کتابوں میں اسلام کی اعلیٰ اقدار کا درس دیا ہے اور اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار سے روشناس کرایا ہے۔ مگر عملی طور پر ہمیں چور بازاری ذخیرہ اندوزی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، جبر و استبداد، سگریٹ و شراب، خود غرضی اور ناانصافی کی تعلیم دی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے ہمیں قرآنِ حکیم کو چومنا، آنکھوں سے لگانا اور کئی کئی دفعہ قرآن ختم کرنا تو سکھا دیا لیکن اپنے ساتھ ہمیں بھی اس کتابِ عظیم کے مفہوم سے ناآشنا رکھا ہے۔

میں آپ سے صرف یہ سوال کرنا چاہتی ہوں میرے بزرگو! کہ آپ کا کوئی ایک فعل بھی ایسا ہے جو آپ کے قول سے متصادم نہ ہو؟ ——— ہر طرف تضاد ہی تضاد ہے! ———

کیا یہی ہے وہ حسین و دلکش پاکستان جس کو لے کر رہنے کے نعرے آپ نے ربع صدی پیشتر لگائے تھے.....؟ کیا یہی ہے اقبالؒ کے حسین خواب کی تعبیر! اور قائدِ اعظمؒ کی جہد و جہد کا ماحصل؟!

اس پر طرّہ یہ کہ آپ اپنے اس سنگین ترین جرم کا اقرار کرنے کی بجائے ہم بچوں پر طرح طرح

کے الزامات لگا رہے ہیں۔

"زمانہ بڑا خراب آگیا ہے جی! نئی نسل تو اپنے قابو ہی میں نہیں رہی۔ نہ بڑوں کا ادب، نہ لحاظ! لڑکیاں لڑکوں سے چار ہاتھ آگے ہیں اور لڑکوں پر فسوانیت کا بھوت سوار ہے! دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے جی! بھلا ہمارے زمانے میں ایسا کاہے کو ہوتا تھا! توبہ توبہ — قیامت کے آثار ہیں!"

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ آج کی نوجوان نسل نہ صرف یہ بلکہ اور بھی بہت کچھ کر رہی ہے!

آج کا نوجوان چرسی اور ریسٹیا ہے! آج کا نوجوان عریانیت اور فحاشین کا دلدادہ، جرم اور تشدد پر آمادہ اور شدید ذہنی انتشار، بے چینی، عدم اعتماد اور مایوسی کا شکار ہے۔

مگر یہ سب کچھ آپ ہی کا تو دیا ہوا ہے بزرگانِ من! آپ خود ہی بتائیے! کیا ایک ٹیڑھی اینٹ پر ایک سیدھی عمارت استوار کی جا سکتی ہے؟؟

آخر میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں میرے بزرگو! کہ ایسی ابلیسی اور مسموم فضا میں پروان چڑھنے کے باوجود ہم — آپ کے بچوں میں اب بھی کچھ کرنے اور کچھ پا لینے کی خواہش موجزن ہے! ہم اسی صلاحیت کش ماحول میں زندگی گزارتے چلے جانا نہیں چاہتے۔

میری اس بات پر چونکئے نہیں کہ ہم تو دلِ مردہ کو دوبارہ زندہ کر کے نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت فاتحِ عالم کی تابناک شمشیروں سے خود کو مسلح کر کے اسی حسین تخیل کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے ہیں؛ جس میں آپ — اب تک ناکام رہے؟؟

کیا آپ اس راہ میں ہمارا ساتھ دیں گے؟؟

۹۔ اعجاز یوسف

صدرِ گرامی قدر و معزز حاضرین!

مجھے اقبالؒ علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آپ یقینِ محکم کی بات کرتے ہیں۔ میں سرے سے یقین ہی نہیں کرتا کہ یہ پیغام میرے لئے ہے۔ عملِ پیہم ہماری تعلیمی پالیسی کے خلاف ہے اور یہ کہنا محبت فاتحِ عالم ہوتی ہے اسلامی تعلیمات کے مطابق تو درست ہو سکتا ہے مگر اسلامی جماعت کے نقطۂ نگاہ سے سراسر غلط ہے، کہ اس کے بانی کے الفاظ

کے الزامات لگا رہے ہیں۔

"زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے جی! نئی نسل تو اپنے قابو ہی میں نہیں رہی۔ نہ بڑوں کا ادب، نہ لحاظ! لڑکیاں لڑکوں سے چار ہاتھ آگے ہیں اور لڑکوں پر نسوانیت کا بھوت سوار ہے! دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے جی! بھلا ہمارے زمانے میں ایسا کاہے کو ہوتا تھا! توبہ توبہ — قیامت کے آثار ہیں!"

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ آج کی نوجوان نسل نہ صرف یہ بلکہ اور بھی بہت کچھ کر رہی ہے!

آج کا نوجوان چرسی اور ریسٹیا ہے! آج کا نوجوان عریانیت اور لچرپن کا دلدادہ، جرم اور تشدد پر آمادہ اور شدید ذہنی انتشار، بے چینی، عدم اعتماد اور مایوسی کا شکار ہے۔

مگر یہ سب کچھ آپ ہی کا تو دیا ہوا ہے بزرگانِ من! آپ خود ہی بتائیے! کیا ایک ٹیڑھی اینٹ پر ایک سیدھی عمارت استوار کی جا سکتی ہے؟؟

آخر میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں میرے بزرگو! کہ ایسی ابلیسی اور مسموم فضا میں پروان چڑھنے کے باوجود ہم — آپ کے بچوں میں اب بھی کچھ کرنے اور کچھ پا لینے کی خواہش موجزن ہے! ہم اسی صلاحیت کش ماحول میں زندگی گزارتے چلے جانا نہیں چاہتے۔

میری اس بات پر چونکیئے نہیں کہ ہم تو دلِ مردہ کو دوبارہ زندہ کر کے نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو یقینِ محکم، عمل پیہم اور محبت فاتحِ عالم کی تابناک شمشیروں سے خود کو مسلح کر کے اُسی حسین تخیّل کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے ہیں؛ جس میں آپ — اب تک ناکام رہے؟؟

کیا آپ اس راہ میں ہمارا ساتھ دیں گے؟؟

۹۔ اعجازِ یوسف

صدرِ گرامی قدر و معزز حاضرین!

مجھے اقبالؒ علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ ؎

یقینِ محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آپ یقینِ محکم کی بات کرتے ہیں۔ میں سرے سے یقین ہی نہیں کرتا کہ یہ پیغام میرے لئے ہے۔ عملِ پیہم ہماری تعلیمی پالیسی کے خلاف ہے اور یہ کہنا محبت فاتحِ عالم ہوتی ہے اسلامی تعلیمات کے مطابق تو درست ہو سکتا ہے مگر اسلامی جماعت کے نقطۂ نگاہ سے سراسر غلط ہے، کہ اس کے بانی کے الفاظ

میں محبت فاتحِ عالم نہیں، بلکہ تشدد فاتحِ عالم ہے۔ حضرتِ مودودی اس پہ مُصِر ہیں کہ اسلام رحمۃ اللعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی شیریںیٔ گفتار سے نہیں بلکہ شمشیرِ خارہ شگاف سے پھیلا تھا۔

ہاں اس بات پر یقینِ محکم ہے کہ یہ شعر نبی آخر الزمان ؐ کی حیاتِ طیبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ سرکارِ دوعالم نے اپنے صحابہ کبارؓ کے دل و دماغ میں اسلام کی ابدی سچائی کے متعلق واقعی یقینِ محکم پیدا کر دیا تھا۔ اس یقین کو لے کر جب ان کی جماعتِ مومنین عملِ پیہم کی راہ پر گامزن ہوئی تو نہ راستے میں آرام کے لئے کوئی پڑاؤ تھا اور نہ راحت کے لئے کوئی وقفہ۔ انہیں حکم ملتا ہے کہ جمعہ کے دن بھی — کہ عیدالمومنین ہے —— صرف نماز کے وقفہ کے لئے کاروبارِ حیات سے ہاتھ روکو اور نماز کے فوراً بعد پھر وہی عملِ پیہم۔ سیرتِ صحابہ کرامؓ ایک کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو ان کے ۳۰ سالہ سنہرے دورِ حکومت میں بیکار بیٹھنے کا تصور ہی نہیں ملے گا۔ ان کے ہاں سرکاری تعطیلات کی فہرست شائع نہیں جاتی کہ تعطیل تو نام ہے عملِ پیہم میں تعطل کا۔ ان کا کام ہی ان کا آرام ہے۔ ان کے شب و روز اس اعلان کی تصویر ہیں کہ ؏

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

یہ تو تھی ان کی زندگی جس سے اقبالؒ نے کسبِ فیض حاصل کر کے اس بلند خیالی کا اظہار کیا تھا۔ اب میری زندگی پہ نگاہ ڈالئے کہ میں اس قوم کی امید اور مستقبل ہوں۔

میں ساتویں کلاس کا طالب علم ہوں۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں ۵۲ چھٹیاں اتوار کرتا ہوں۔ قریباً ۹۰ چھٹیاں موسم گرما کی ہوتی ہیں۔ ۱۵ دن موسم سرما کی چھٹیاں مناتا ہوں۔ سال میں ۵۲ دفعہ ہی جمعہ کو آدھی چھٹی ہوتی ہے۔ تفریح کے طور پر ۱۵ دن برائے نام مینوئل ورک کرتا ہوں۔ کچھ چھٹیاں امتحان کی تیاری کے لئے امتحان سے چند روز پہلے مل جاتی ہیں۔ کچھ امتحان کے بعد نتائج کے انتظار میں تاکہ فارغ وقت میں ممتحن پر سیاسی اور سماجی دباؤ ڈال کر اپنے نمبر بڑھا سکوں۔ کچھ غیر حاضریاں ضروری کام اور بخار کے بہانے کرتا ہوں اور جب سکول میں حاضر ہوتا ہوں تو علاوہ انہیں دنوں استاد بوجہ ضروری کام یا خرابیٔ صحت غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں کورس کی کتابیں وقت پر نہ چھپنے کے سبب کئی روز تک سکول میں نئی فلموں پر تبصرہ کرتا ہوں۔ یونین کے الیکشن پڑھائی کو الگ معطل کرتے ہیں۔ الیکشن کے بعد الیکشن کے ثمرات ہیں۔ الیکشن کے دوران گرفتار ہونے والے طالب علم رہنماؤں کی رہائی کے لئے جلسے کا انتظام اور جلوس کا اہتمام۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار ہو کر عدالتوں کی پیشیاں۔ مخالف طلبا کو زخمی کرنے کے سلسلے میں کہیں کی پیشی الگ۔ پھر اپنے دفاع کے لئے وکیلوں سے قانونی مشورے۔ روایتی طالب علم ہونے کے سبب پاکستان میں سب سے فعال تنظیم "اسلامی جمعیت طلباء" کا ممبر ہوں۔ جب رہنمائی کے لئے اس کی طرف دیکھتا ہوں تو ہائی کمانڈ سے حکم ملتا ہے۔ یہ حکومت جمہوری قدروں پہ یقین نہیں رکھتی اس لئے محبت کی بجائے تشدد کی پالیسی جاری رکھو کہ حق مانگنے سے نہیں بلکہ چھیننے سے ملتا ہے۔ اور سکول کی سیاست میں حصہ لینا میرا بنیادی حق ہے اور یہ بھی میرا بنیادی حق ہے کہ

میں محبت فاتحِ عالم نہیں، بلکہ تشدد فاتح عالم ہے۔ حضرت مودودی اس بات پر مُصر ہیں کہ اسلام رحمۃ اللعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی شیریں گفتار سے نہیں بلکہ شمشیر خارہ شگاف سے پھیلا تھا۔

ہاں اس بات پر یقینِ محکم ہے کہ یہ شعر نبی آخر الزمانؐ کی حیاتِ طیبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ سرکارِ دوعالم نے اپنے صحابہ کبارؓ کے دل و دماغ میں اسلام کی ابدی سچائی کے متعلق واقعی یقینِ محکم پیدا کر دیا تھا۔ اس یقین کو لے کر جب ان کی جماعتِ مومنین عمل پیہم کی راہ پر گامزن ہوئی تو نہ راستے میں آرام کے لئے کوئی پڑاؤ تھا اور نہ راحت کے لئے کوئی وقفہ۔ انہیں حکم ملتا ہے کہ جمعہ کے دن بھی — کہ عیدالمومنین ہے — صرف نماز کے وقفہ کے لئے کاروبارِ حیات سے ہاتھ روکو اور نماز کے فوراً بعد پھر وہی عمل پیہم۔ سیرتِ صحابہ کرامؓ ایک کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو ان کے ۳۰ سالہ سنہرے دورِ حکومت میں بیکار بیٹھنے کا تصور ہی نہیں ملے گا۔ ان کے ہاں سرکاری تعطیلات کی فہرست شائع نہیں جاتی کہ تعطیل تو نام ہے عملِ پیہم میں تعطل کا۔ ان کا کام ہی ان کا آرام ہے۔ ان کے شب و روز اس اعلان کی تصویر ہیں کہ ؎

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

یہ تو تھی ان کی زندگی جس سے اقبالؒ نے کسبِ فیض حاصل کر کے اس بلند خیالی کا اظہار کیا تھا۔ اب میری زندگی پر نگاہ ڈالئے کہ میں اس قوم کی امید اور مستقبل ہوں۔

میں ساتویں کلاس کا طالب علم ہوں۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں ۵۲ چھٹیاں اتوار کرتا ہوں۔ قریباً ۹۰ چھٹیاں موسم گرما کی ہوتی ہیں۔ ۱۵ دن موسم سرما کی چھٹیاں مناتا ہوں۔ سال میں ۵۲ دفعہ ہی جمعہ کو آدھی چھٹی ہوتی ہے۔ تفریح کے طور پر ۱۵ دن ہر ائے نام مینوئل ورک کرتا ہوں۔ کچھ چھٹیاں امتحان کی تیاری کے لئے امتحان سے چند روز پہلے مل جاتی ہیں۔ کچھ امتحان کے بعد نتائج کے انتظار میں تاکہ فارغ وقت میں ممتحن پر سیاسی اور سماجی دباؤ ڈال کر اپنے نمبر بڑھا سکوں۔ کچھ غیر حاضریاں ضروری کام اور بخار کے بہانے کرتا ہوں اور جب سکول میں حاضر ہوتا ہوں تو عین انہیں دنوں استاد بوجہ ضروری کام یا خرابی صحت غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں کورس کی کتابیں وقت پر نہ چھپنے کے سبب کئی روز تک سکول میں نئی فلموں پر تبصرہ کرتا ہوں۔ یونین کے الیکشن پڑھائی کو الگ معطل کرتے ہیں۔ الیکشن کے بعد الیکشن کے ثمرات ہیں۔ الیکشن کے دوران گرفتار ہونے والے طالب علم رہنماؤں کی رہائی کے لئے جلسے کا انتظام اور جلوس کا اہتمام۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار ہو کر عدالتوں کی پیشیاں۔ مخالف طلبا کو زخمی کرنے کے سلسلے میں کیس کی پیشی الگ۔ پھر اپنے دفاع کے لئے وکیلوں سے قانونی مشورے۔ روایتی طالب علم ہونے کے سبب پاکستان میں سب سے فعال تنظیم "اسلامی جمعیت طلبا" کا ممبر ہوں۔ جب رہنمائی کے لئے اس کی طرف دیکھتا ہوں تو ہائی کمانڈ سے حکم ملتا ہے۔ یہ حکومت جمہوری قدروں پر یقین نہیں رکھتی اس لئے محبت کی بجائے تشدد کی پالیسی جاری رکھو کہ حق مانگنے سے نہیں بلکہ چھیننے سے ملتا ہے۔ اور سکول کی سیاست میں حصہ لینا میرا بنیادی حق ہے اور یہ بھی میرا بنیادی حق ہے کہ

میں اختلافِ رائے کی بنا پر اپنے ساتھی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دوں۔ اُستاد کو گریبان سے پکڑ لوں، دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں سڑکوں پر نکل آؤں۔ بسوں کے شیشے توڑوں اور ایک سیاسی جماعت کا آلۂ کار بنتے ہوئے آئینی اور اخلاقی حدود کو پھلانگ جاؤں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں صرف ۶۵ دن ہی میں اپنے تعلیمی عمل کو جاری رکھ سکا۔ اور ۳۰۰ دن تعلیمی پالیسی بنانے والوں کی نذر ہو گئے۔ انہی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ یہ عملِ پیہم کا حامل پیغام میرے لئے نہیں ہے۔ جہاں بے عملی کی سرکاری اور سیاسی سطح پر سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جائے وہاں عملِ پیہم کے پیغام کو کون سنے گا۔

اس سب کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سکول جانے والے قریباً ایک کروڑ پاکستانی بچے یقینِ محکم کے لئے بے قرار۔ عملِ پیہم کے لئے بے چین اور اظہارِ محبت کے لئے بے تاب ہیں۔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہم طالب علم سال کے ۳۶۵ دن ہی عملِ پیہم کا نمونہ بننا چاہتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے ہم اپنی تعلیم کے دوران کسی چھٹی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ یاد رکھئے! ہم قوم کے مستقبل کے معمار ہیں۔ ہماری تربیت کا بار آپ کے کندھوں پر ہے۔ اگر آپ نے ہمیں موجودہ بے عملی کی فضا سے نکال کر عملِ پیہم کے سانچے میں نہ ڈھالا۔ یقینِ محکم کا مجسمہ اور محبت کا نمونہ نہ بنایا تو کل کو خدا کے ہاں آپ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ہمیں تو معصوم سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا مگر آپ تو عاقل و بالغ ہیں۔ آپ کونسا عذر پیش کریں گے؟

میرے بزرگ سامعینِ کرام! میں خدا کے نام پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر آپ میرے ساتھیوں اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی بقا چاہتے ہیں۔ دینِ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو ان درسگاہوں میں موجودہ نظامِ تعلیم کو بدل دیجئے جو محبت و اخوت کی تعلیم دینے کی بجائے نفرت اور تشدد کی تربیت دیتا ہے اور اگر ملکی نظامِ تعلیم کو بدلنا آپ کے بس میں نہیں تو کم از کم طلوعِ اسلام کے مجوزہ کالج ہی کو قائم کر دیجئے اور اس موقع کو غنیمت جانئے کہ ابھی آپ کو ع

اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت

میسر ہے جس کی راہنمائی آپ کی منزل کو قریب سے قریب تر کر دے گی۔ موجودہ حالات میں یہی کالج، اقبالؒ کے خواب کی سچی تعبیر اور تخیل کی منہ بولتی تصویر بن سکتا ہے۔ اگر آپ نے پرویز صاحب کے درسِ قرآن اور کنونشن کے خطاب سن کر یہ سمجھ لیا کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا اور قوم کے مستقبل سے اغماض برتتے ہوئے ایسے قیمتی مواقع کو ع

نشستند و گفتند و برخاستند

کی نذر کر دیا تو یاد رکھئے۔ ع

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

والسلام

میں اختلافِ رائے کی بنا پر اپنے ساتھی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دوں۔ اُستاد کو گریبان سے پکڑ لوں، دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں سڑکوں پہ نکل آؤں۔ بسوں کے شیشے توڑوں اور ایک سیاسی جماعت کا آلۂ کار بنتے ہوئے آئینی اور اخلاقی حدود کو پھلانگ جاؤں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں صرف ۶۵ دن ہی میں اپنے تعلیمی عمل کو جاری رکھ سکا۔ اور ۳۰۰ دن تعلیمی پالیسی بنانے والوں کی نذر ہو گئے۔ انہی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ یہ عملِ پیہم کا حامل پیغام میرے لئے نہیں ہے۔ جہاں بے عملی کی سرکاری اور سیاسی سطح پہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہو وہاں عملِ پیہم کے پیغام کو کون سنے گا۔

اس سب کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سکول جانے والے قریباً ایک کروڑ پاکستانی بچے یقینِ محکم کے لئے بے قرار۔ عملِ پیہم کے لئے بے چین اور اظہارِ محبت کے لئے بے تاب ہیں۔ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہم طالب علم سال کے ۳۶۵ دن ہی عملِ پیہم کا نمونہ بننا چاہتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے ہم اپنی تعلیم کے دوران کسی چھٹی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ یاد رکھئے! ہم قوم کے مستقبل کے معمار ہیں۔ ہماری تربیت کا بار آپ کے کندھوں پہ ہے۔ اگر آپ نے ہمیں موجودہ بے عملی کی فضا سے نکال کر عملِ پیہم کے سانچے میں نہ ڈھالا۔ یقینِ محکم کا مجسمہ اور محبت کا نمونہ نہ بنایا تو کل کو خدا کے ہاں آپ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ہمیں تو معصوم سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا مگر آپ تو عاقل و بالغ ہیں۔ آپ کونسا عذر پیش کریں گے؟

میرے بزرگ سامعین کرام! میں خدا کے نام پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر آپ میرے ساتھیوں اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی بقا چاہتے ہیں۔ دینِ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو ان درسگاہوں میں موجودہ نظامِ تعلیم کو بدل دیجئے جو محبت و اخوت کی تعلیم دینے کی بجائے نفرت اور تشدد کی تربیت دیتا ہے اور اگر ملکی نظامِ تعلیم کو بدلنا آپ کے بس میں نہیں تو کم از کم طلوعِ اسلام کے مجوزہ کالج ہی کو قائم کر دیجئے اور اس موقع کو غنیمت جانئے کہ الٰہی آپ کو ؎

اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت

میسر ہے جس کی راہنمائی آپ کی منزل کو قریب سے قریب تر کر دے گی۔ موجودہ حالات میں یہی کالج، اقبالؒ کے خواب کی سچی تعبیر اور تخیل کی منہ بولتی تصویر بن سکتا ہے۔ اگر آپ نے پرویز صاحب کے درسِ قرآن اور کنونشن کے خطاب سن کر یہ سمجھ لیا کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا اور قوم کے مستقبل سے اغماض برتتے ہوئے ایسے قیمتی مواقع کو ؎

نشستند و گفتند و برخاستند

کی نذر کر دیا تو یاد رکھئے۔ ؎

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

والسلام

۱۰۔ نعمانی اکبر

محترمہ صدر صاحبہ، قابلِ احترام باجی، بزرگو، بہنو اور بھائیو!

سائنس کی ایک طالبہ علم ہونے کے ناطے سے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یقین پختہ اُسی چیز پر ہو سکتا ہے جو تجربے سے درست ثابت ہوتی ہو اور بار بار کے تجربے سے وہی نتائج برآمد ہوئے ہوں ـــــ تجربہ نتیجہ ہوتا ہے ایک ذہنی خیال پر عمل کرنے کا۔ وہ ذہنی خیال جسے سائنس کی زبان میں (HYPOTHESIS) کہتے ہیں۔ گویا تجربہ (EXPERIMENT) بذاتِ خود عمل ہے۔ تجربے سے جو کچھ اخذ کیا جاتا ہے اس سے ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو اس کو درست یا غلط ثابت کرتا ہے۔ نتائج اخذ کرنے کے لئے دیکھنا، سننا، سونگھنا ضروری ہوتا ہے ـــــ قرآن پاک بھی انہی ذرائع علم کا ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی طاقتیں دیں تاکہ تم کائنات پر غور و فکر کرو۔ حواس قلب دیا تاکہ تم اور پھر سے حاصل کردہ مواد سے نتائج اخذ کر سکو ـــــ اور علم کا دوسرا سرچشمہ جو ان سب سے ممتاز ہے وہ ہے وحی کا دیا ہوا علم جس پر ہر مومن کا ایمان ہے ـــــ اور اس ایمان کے بغیر کوئی حرکت، کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نیک عمل کے لئے آخر ایمان کی کیا ضرورت ہے؟ نیک عمل ایمان کے بغیر بھی ہو سکتے ہیں ـــــ ثبوت کے طور پر وہ (NON-BELIEVERS) کے اچھے اعمال سچ، نیکی، کمزوروں، ناتوانوں سے ہمدردی، بہبودِ انسانیت کے لئے بھلائی کے کاموں کی مثالیں دیتے ہیں۔

میں کہتی ہوں نیک عمل تو ایک طرف بُرے عمل بلکہ کسی بھی عمل کے لئے ایمان ـــــ جو یقینِ محکم ہی کا دوسرا نام ہے، لازمی شرط ہے ـــــ اگر ایک چور کو یقین نہ ہو کہ وہ جہاں چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہاں سے اسے مال ضرور ملے گا تو وہ کبھی پہلا قدم بھی اس طرف نہیں بڑھائے گا۔ اگر نقب لگانے والے کو یہ یقین نہ ہو کہ وہ پکڑا نہیں جائے گا تو وہ نقب لگانے سے پہلے سو بار سوچے گا ـــــ بُرا قدم اٹھانے سے پہلے بھی یقین کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ آپ اسے اللہ پہ ایمان نہیں، طاغوت پر، شیطان پہ ایمان کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح نیک قدم اٹھانے سے پہلے بھی یہ یقین ہوتا ہے کہ میرا یہ عمل ایک نتیجہ ضرور پیدا کرے گا۔ یہ عمل اگر فوری طور پہ نتیجہ خیز نہیں ہوگا تو آئندہ زندگی میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ یہی آخرت پہ ایمان ہے۔ یہی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کا مطلب ہے ـــــ اس لئے مومن ایسے کام بغیر کسی جھجک کے، بغیر کسی شک و شبہ کے، کر گزرتے ہیں۔ جن میں ایک عام آدمی کو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، فائدہ تو کیا صریح نقصان نظر آتا ہے۔ مگر اس کے دل میں یہ یقینِ محکم ہوتا ہے کہ یہاں نقصان اٹھانا بہتر ہے بہ نسبت آخرت میں خدا کے روبرو شرمندہ ہونے کے ـــــ یہی ضرورت ہے ایمان کی۔ نیک اعمال کے لئے (NON-BELIENERS) اگر کوئی نیک کام کرتے بھی ہیں تو ان کے پیشِ نظر اپنا کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر نیک کاموں میں فائدہ ہی فائدہ نظر آئے تو پھر کسی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ نقصان بھی اٹھائے اور کفر کی تہمت بھی اپنے سر لے۔

اگر ایک کسان کو یہ یقین نہ ہو کہ یہ دانے جو بہترین فصل کے دانے ہیں زمین میں بو کر وہ ایک مقررہ مدت کے بعد اس سے سینکڑوں ہزاروں گنا زیادہ دانے حاصل کرے گا تو وہ کبھی ان دانوں کو زمین میں نہ ڈالے۔ کبھی سردیوں کی منجمد

۱۰۔ نعمانی اکبر

محترمہ صدر صاحبہ، قابلِ احترام باجی، بزرگو، بہنو اور بھائیو!

سائنس کی ایک طالبہ علم ہونے کے ناطے سے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یقین پختہ اُسی چیز پہ ہو سکتا ہے جو تجربے سے درست ثابت ہوئی ہو اور بار بار کے تجربے سے وہی نتائج برآمد ہوئے ہوں ـــــ تجربہ نتیجہ ہوتا ہے ایک ذہنی خیال پر عمل کرنے کا۔ وہ ذہنی خیال جسے سائنس کی زبان میں (HYPOTHESIS) کہتے ہیں۔ گویا تجربہ (EXPERIMENT) بذاتِ خود عمل ہے۔ تجربے سے جو کچھ اخذ کیا جاتا ہے اس سے ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو اس کو درست یا غلط ثابت کرتا ہے۔ نتائج اخذ کرنے کے لئے دیکھنا، سننا، سونگھنا ضروری ہوتا ہے ـــــ قرآن پاک بھی انہی ذرائع علم کا ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی طاقتیں دیں تاکہ تم کائنات پر غور و فکر کرو۔ حواس قلب دیا تاکہ تم اور پھر سے حاصل کردہ مواد سے نتائج اخذ کر سکو ـــــ اور علم کا دوسرا سرچشمہ جو ان سب سے مختلف ہے وہ ہے وحی کا دیا ہوا علم جس پہ ہر مومن کا ایمان ہے ـــــ اور اس ایمان کے بغیر کوئی حرکت، کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نیک عمل کے لئے آخر ایمان کی کیا ضرورت ہے؟ نیک عمل ایمان کے بغیر بھی ہو سکتے ہیں ـــــ ثبوت کے طور پہ وہ (NON-BELIEVERS) کے اچھے اعمال سچ، نیکی، کمزوروں، ناتوانوں سے ہمدردی، بہبودِ انسانیت کے لئے بھلائی کے کاموں کی مثالیں دیتے ہیں۔

میں کہتی ہوں نیک عمل تو ایک طرف بُرے عمل بلکہ کسی بھی عمل کے لئے ایمان ـــــ جو یقینِ محکم ہی کا دوسرا نام ہے، لازمی شرط ہے ـــــ اگر ایک چور کو یقین نہ ہو کہ وہ جہاں چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہاں سے اسے مال ضرور ملے گا تو وہ کبھی پہلا قدم بھی اس طرف نہیں بڑھائے گا۔ اگر نقب لگانے والے کو یہ یقین نہ ہو کہ وہ پکڑا نہیں جائے گا تو وہ نقب لگانے سے پہلے سو بار سوچے گا ـــــ بُرا قدم اٹھانے سے پہلے بھی یقین کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ آپ اسے اللہ پہ ایمان نہیں، طاغوت پر، شیطان پہ ایمان کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح نیک قدم اٹھانے سے پہلے بھی یہ یقین ہوتا ہے کہ میرا یہ عمل ایک نتیجہ ضرور پیدا کرے گا۔ یہ عمل اگر فوری طور پہ نتیجہ خیز نہیں ہوگا تو آئندہ زندگی میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ یہی آخرت پہ ایمان ہے۔ یہی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کا مطلب ہے ـــــ اس لئے مومن ایسے کام بغیر کسی جھجک کے، بغیر کسی شک و شبہ کے، کر گزرتے ہیں۔ جن میں ایک عام آدمی کو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، فائدہ تو کیا صریح نقصان نظر آتا ہے۔ مگر اس کے دل میں یہ یقینِ محکم ہوتا ہے کہ یہاں نقصان اٹھانا بہتر ہے بہ نسبت آخرت میں خدا کے روبرو شرمندہ ہونے کے ـــــ یہی ضرورت ہے ایمان کی۔

نیک اعمال کے لئے (NON-BELIENERS) اگر کوئی نیک کام کرتے بھی ہیں تو ان کے پیشِ نظر اپنا کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے ایسا کے برعکس اگر نیک کاموں میں فائدہ ہی فائدہ نظر آئے تو پھر کسی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ نقصان بھی اٹھائے اور کفر کی تہمت بھی اپنے سر لے۔

اگر ایک کسان کو یہ یقین نہ ہو کہ یہ دانے جو بہترین فصل کے دانے ہیں زمین میں بو کر وہ ایک مقررہ مدت کے بعد اس سے سینکڑوں ہزاروں گنا زیادہ دانے حاصل کرے گا تو وہ کبھی ان دانوں کو زمین میں نہ ڈالے۔ کبھی سرویوں کی منجمد

کر دینے والی صبحوں کو کھیتوں میں ہل چلانے، پانی دینے میں ضائع نہ کرے — مزے سے سوئے — کبھی گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جسم کو نہ جلائے — مگر وہ ایسا کرتا ہے۔ اِس لئے کہ اُسے خدا کے اس قانون پر یقین محکم ہوتا ہے کہ بیج ڈالنے مقررہ دیکھ بھال کے بعد اسے فصل سے مالا مال کر دیں گے — اور اسے یہ بھی پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ گندم بو رہا ہے تو یقیناً اسے گندم ہی کی فصل ملے گی۔ گندم کا دانہ، جو یا باجرے کی فصل نہیں لائے گا — یہ ایمان ہے جو اسے عمل پہ اکساتا ہے۔ مگر بعض اعمال ایسے بھی نظر آتے ہیں جو بظاہر نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ وہاں ہمیں سائنسدان کی طرح دیکھنا ہوگا کہ تجربے میں استعمال ہونے والا خام مال ٹھیک، اور اصلی ہے۔ درست درجۂ حرارت دیا گیا ہے — درست وقت تک جب ہم جہاں چیک کریں گے تو کہیں نہ کہیں کوئی غلطی نکل ہی آئے گی — ہماری زندگیوں میں بھی ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ ہم نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق نہ دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر ہم غور کریں تو غلطی آخر کہیں ہماری اپنی ہی ہوتی ہے — اِنسانوں کی زندگی میں بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ کوئی تحریک اُٹھتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پھیل جاتی ہے مگر بہت جلد وہ نتائج پیدا کئے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جذباتی تحریکیں، ہم مسلمانوں کا تو خاصا ہے۔ جب یہ تحریک آگے نہیں چل پاتی تو ہم "دوسروں کو، تقدیر کو۔ حالات کو۔ کوستے ہیں۔ ہر کسی کو کوستے ہیں سوائے اپنے" — حالانکہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہم ثابت قدم نہیں رہتے۔ ہم بہت جلد اُکتا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم وہ عملِ پیہم نہیں کرتے جو اس کی کامیابی کے لئے ضروری تھا۔ لیبارٹری کی زبان میں جو نتیجہ (۱۰۰) درجہ حرارت لینے آدھ گھنٹے بعد دینا تھا، چند ہی منٹ بعد وہ نتیجہ نہ دیکھ کر ہم مایوس ہو کر گیس کی بتی، گُل کر دیتے ہیں — حالانکہ اگر کچھ دیر اور حرارت پہنچائی جاتی تو مطلوبہ نتائج سامنے آ جاتے — اِسی لئے اکثر صرف عمل ہی نہیں عملِ پیہم کی ضرورت ہوتی ہے — اگر انسان جلد اُکتا جائے۔ کہے کہ میں پانی دیتا دیتا، رکھوالی کرتا کرتا گرمی سردی جھیلتا تھک گیا ہوں۔ اب پودے نکل آئے ہیں۔ انہیں بڑھنا ہوگا تو خود بخود بڑھ جائیں گے۔ بہت محنت کر لی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو نتیجہ ظاہر ہے، فصل تو کیا اُس کا بیج بھی ضائع ہو جائے گا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اِس جہان میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں کسی بات پر بھی ایمان نہیں ہوتا، کسی بات پہ بھی یقین نہیں ہوتا — اول تو یہ بات ممکن ہی نہیں۔ اللہ پہ نہیں تو طاغوت پر ایمان ہوگا۔ اپنے آپ پر، اپنے عزائم اور حکمتِ عمل پہ یقین ہوگا جس کے لئے وہ دنیا میں اپنے فائدے کے لئے کام کرتا ہے — اگر ایسا بھی نہیں۔ مکمل بے عملی کی زندگی ہے تو ایسے مایوس لوگوں کی زندگی انسانوں کی نہیں جانوروں کی ہو سکتی ہے — اور ان کا عمل کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بغیر کسی مقصد اور سمت کے ہوا کے رُخ پر، بادلِ نخواستہ خرام سے زیادہ کچھ نہیں۔

اور یہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم، اسی وقت انسانیت کے لئے بہتر اور بھلائی کے پیامبر ہو سکتے ہیں۔ جب انہیں بروئے کار لانے والوں کا دل انسانیت کی محبت سے لبریز ہو — اگر ایسا نہیں تو یہ عمل دنیا میں بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافے کا موجب ہو سکتا ہے، انسانیت کی بھلائی کا نہیں، جیسے آجکل کی بڑی بڑی طاقتوں اور بڑے بڑے سیاستدانوں کا پیہم عمل ہے — تو بہنو اور بھائیو! یہ ہے میری ناچیز سمجھ کے مطابق اس مصرعہ کا مفہوم جو آج کے مذاکرے کا موضوع ہے۔ ع

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم

کر دینے والی صبحوں کو کھیتوں میں ہل چلانے، پانی دینے میں ضائع نہ کرے۔ مزے سے سوئے۔ کبھی گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جسم کو نہ جلائے۔ مگر وہ ایسا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اسے خدا کے اس قانون پر یقینِ محکم ہوتا ہے کہ یہ والے مقررہ دیکھ بھال کے بعد اسے فصل سے مالا مال کر دیں گے۔ اور اسے یہ بھی پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ گندم بو رہا ہے تو یقیناً اسے گندم ہی کی فصل ملے گی۔ گندم کا دانہ، جَو یا باجرے کی فصل نہیں لائے گا۔ یہ ایمان ہے جو اسے عمل پر اکساتا ہے۔ مگر بعض اعمال ایسے بھی نظر آتے ہیں جو بظاہر نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ وہاں ہمیں سائنسدان کی طرح دیکھنا ہوگا کہ تجربے میں استعمال ہونے والا خام مال ٹھیک، اور اصلی ہے۔ درست درجۂ حرارت دیا گیا ہے۔ درست وقت تک جب ہم جہاں پھٹک کریں گے تو کہیں نہ کہیں کوئی غلطی نکل ہی آئے گی۔ ہماری زندگیوں میں بھی ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ ہم نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق نہ دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر ہم غور کریں تو غلطی آخر کہیں ہماری اپنی ہی ہوتی ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ کوئی تحریک اٹھتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پھیل جاتی ہے مگر بہت جلد وہ نتائج پیدا کئے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جذباتی تحریکیں، ہم مسلمانوں کا تو خاصا ہے۔ جب یہ تحریک آگے نہیں چل پاتی تو ہم "دوسروں کو" "تقدیر کو۔ حالات کو۔ کوستے ہیں۔ ہر کسی کو کوستے ہیں "سوائے اپنے"۔ حالانکہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہم ثابت قدم نہیں رہتے۔ ہم بہت جلد اُکتا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم وہ عملِ پیہم نہیں کرتے جو اس کی کامیابی کے لئے ضروری تھا۔ لیبارٹری کی زبان میں جو نتیجہ (۱۰۰) درجہ حرارت نے آدھ گھنٹے بعد دیتا تھا، چند ہی منٹ بعد وہ نتیجہ نہ دیکھ کر ہم مایوس ہو کر گیس کی بتی، گل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر کچھ دیر اور حرارت پہنچائی جاتی تو مطلوبہ نتائج سامنے آ جاتے۔ اسی لئے اکثر صرف عمل ہی نہیں عملِ پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان جلد اُکتا جائے۔ کہے کہ میں پانی دیتا دیتا، رکھوالی کرتا کرتا، گرمی سردی جھیلتا تھک گیا ہوں۔ اب پودے نکل آئے ہیں۔ انہیں بڑھنا ہوگا تو خود بخود بڑھ جائیں گے۔ بہت محنت کرلی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو نتیجہ ظاہر ہے، فصل تو کیا اُس کا بیج بھی ضائع ہو جائے گا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس جہان میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں کسی بات پر بھی ایمان نہیں ہوتا، کسی بات پر بھی یقین نہیں ہوتا۔ اول تو یہ بات ممکن ہی نہیں۔ اللہ پر نہیں تو طاغوت پر ایمان ہوگا۔ اپنے آپ پر، اپنے عزائم اور حکمتِ عمل پر یقین ہوگا جس کے لئے وہ دنیا میں اپنے فائدے کے لئے کام کرتا ہے۔ اگر ایسا بھی نہیں۔ مکمل بے عمل کی زندگی ہے تو ایسے مایوس لوگوں کی زندگی انسانوں کی نہیں جانوروں کی ہو سکتی ہے۔ اور ان کا عمل کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بغیر کسی مقصد اور سمت کے ہوا کے رُخ پر، بادلِ نخواستہ حرام سے زیادہ کچھ نہیں۔

اور یہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم، اسی وقت انسانیت کے لئے بہتر اور بھلائی کے پیامبر ہو سکتے ہیں۔ جب اسے بروئے کار لانے والوں کا دل انسانیت کی محبت سے لبریز ہو۔ اگر ایسا نہیں تو یہ عمل دنیا میں بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافے کا موجب ہو سکتا ہے، انسانیت کی بھلائی کا نہیں، جیسے آجکل کی بڑی بڑی طاقتوں اور بڑے بڑے سیاستدانوں کا پیہم عمل ہے۔ تو بہنوں اور بھائیو! یہ ہے میری ناچیز سمجھ کے مطابق اس مصرعہ کا مفہوم جو آج کے مذاکرے کا موضوع ہے۔ ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبتِ فاتحِ عالم